الله

﴿ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾
(اور اپنی طرف سے ایک علم سکھایا تھا)

معارفِ فقیر

مؤلف

فقیر یوسف احمد نقشبندی مجددی

ناشر
مکتبۂ فقیر
۵۱/اوَبرن سٹریٹ، بولٹن، یو، کے

تفصیلات

کتاب کا نام :..معارفِ فقیر
مؤلف کا نام :..فقیر یوسف احمد نقشبندی مجددی
صفحات : ۱۰۵
ایڈیشن : پہلا ایڈیشن
تعداد : ۱۱۰۰
سن اشاعت : شوال ۱۴۳۴ھ مطابق اگست ۲۰۱۳ء

﴿ ملنے کا پتہ ﴾
صحت یونانی اینڈ آیورویدک اسٹورس، ہجوری چمبرس کے بازو میں،
صلابت پورا، مین روڈ، سورت، گجرات، انڈیا۔
Mob: 09825798987

﴿ یو، کے میں ملنے کے پتے ﴾
(1) MAKTAB-E-FAQEER: 51, AUBURN STREET BOLTON, BL3 6UE, U.K.
(2) KHALID ZAFAR: 133, ST. JAMESS ROAD, BLACKBURN, U.K.

فہرست

تقریظ

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی خالِد سَیفُ اللہ صاحب گنگوہی نقشبندی حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ

(صحبت یافتہ امام العارفین حضرت اقدس مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی نقشبندی مجددیؒ۔اجازت یافتہ حضرت شیخ مولانا محمد قمرالزماں صاحب الہٰ آبادی دامت برکاتہم۔وپیرحضرت شیخ آصف حسین صاحب فاروقی نقشبندی دامت برکاتہم بولٹن ،برطانیہ)

الحمد لله رب العالمین، والصلاة علی أفضل الأنبیاء والمرسلین وعلی آله وأصحابه أجمعین .

انسان کے لیےسب سے بڑی فضیلت اورسعادت اس کا مرضیاتِ رب پر چلنا ہے اورسب سے بڑی شقاوت اور نقصان اس کا اپنی مرضیات پر چلنا ہے ،جب انسان اپنے محبوب مولیٰ تعالیٰ کی مرضیات پرچل کرقربِ الٰہی کے مدارج اور کمالات کا طالب ہوتا ہےاور یہ چاہتا ہے کہ نفس وشیطان کی مکاریوں سے نجات پا جائے اور رذائل سے تخلیہ اور خصائلِ حسنہ کے ساتھ متصف ہو جائے اور روحانی ترقیات پر فائز ہو تواس کے لیے کسی طریقہ کی تلاش کرتا ہے اور کسی مرشد کامل کی ہدایات اور رہبری کا محتاج ہوتا ہے جس کے ذریعہ اپنے محبوب تعالیٰ کے ساتھ وصول اور قرب کے مقامات طے کرے، یہ اس کا ایک فطری جذبہ ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں معارف وعلوم اور ہدایت کے طریقوں کو سمجھنے کے لیے علماء،صلحاء نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں، ان میں معارفِ فقیر ایک زبردست نافع اور جامع حقائق کا

مجموعہ ہے جس میں تصوف کے حقائق و دقائق اور معرفت و محبتِ الٰہی کے رموز و اسرار، بحر معرفت میں غرق ہو کر لکھے گئے ہیں، جن کے مطالعہ سے قلب و روح کو اس کی غذا میسر آتی ہے اور اس سلسلہ کے معارف و علوم حقائق و نوامیس سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے اس کتاب کے مصنف کو اس کام کے لیے منتخب فرما لیا ہے اور ان کا سینہ بحر معرفت کے لیے مفتوح فرما دیا ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کے مصنف حضرت صوفی یوسف احمد نقشبندی مجددی صاحب زید مجدہ خلیفۂ حضرت اقدس مولانا اسماعیل واڈی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس راہ کے غواص اور ماہر کامل معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی تصوف و سلوک، تصفیہ و عرفان کے سلسلہ میں ''تربیت السالکین'' تحریر فرما چکے ہیں، جس میں بڑے بڑے علماء کی تقریظات ہیں، حق جل مجدہ سے قوی امید ہے کہ یہ ''معارفِ فقیر'' اس راہ پر چلنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ اور مؤلف موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگی۔ اللہ پاک اس مقدس کتاب کو قبولیتِ عامہ تامہ نصیب فرمائے، اور ہم سب کو اپنی رضا اور قرب سے شادکام فرمائے اور اپنے صلحا، عرفاء ابرار، اتقیاء میں شمار فرمائے آمین یارب العالمین۔

والسلام

ناکارہ خالد سیف اللہ گنگوہی

خادم اکابر گنگوہ و خادم جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ سہارنپور، یوپی، انڈیا

۱۳ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ

عرض مؤلف

باسمہ تعالیٰ

حمد اور ثنا زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی، جس نے بنی نوع انسان کو گونا گوں کمالات کا مظہر بنایا۔ نبیوں اور ولیوں کو تکمیل کا وسیلہ بنایا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اس سلسلہ میں مزید ارشاد کے ساتھ ان سب پر فضیلت بخشی، اس وجہ سے آپ ﷺ کی اُمت کو بھی بہترین اُمت بنایا۔ آپ ﷺ کی اُمت میں سے بعض کو ولایت خاصہ کے ساتھ محفوظ رکھا، اور آپ ﷺ کی ظاہری اور باطنی پیروی کی دلیل یہ بنائی کہ ﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ یعنی (اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے گناہ معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔ اور جس شخص نے آپ ﷺ کی متابعت کی سعادت سے روگردانی کی، وہ ابدی بدبختی کے ذریعہ ہلاک ہوگیا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُلْ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ یعنی (کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو پسند نہیں رکھتا) پس جو کوئی ولایتِ خاصہ کی خلعت سے مشرف ہونا چاہے، اسے آپ ﷺ کی پیروی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس مطلب کی بنا پر فقیر حقیر یوسف ابن احمد نقشبندی (حق تعالیٰ اس کا نصیب بھی ان بزرگواروں کی طرح محمود بنائے) نے بہ حکم الٰہی چاہا کہ سیرتِ مصطفویہ ﷺ اور طریقِ عالیہ سے جو تھوڑی سی خوشبو اسے حضرت مخدومی اور ملک برطانیہ کے قطب

شیخ المشائخ حضرت مولانا اسماعیل صاحب نقشبندی مجددی المعروف مولانا واڈی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے پہنچی ہے، اسے قیدِ تحریر میں لائے، تاکہ سالکین طریقت کو کارآمد ہواور اس کے فوائد زمانے میں باقی رہیں۔

جان لے کہ اس طائفہ کی باتیں ایسی ہیں کہ اہلِ محبت کے لیے نیلِ مصر کے پانی کی طرح ہیں، مگر بے گانہ محبت کے لیے تو ایک مصیبت ہیں، جو شخص افسانہ پڑھتا ہے اس کے سامنے ایک قصہ نظر آتا ہے، مگر جو شخص اپنی ذات میں غور کرتا ہے وہ مردِ کامل بن جاتا ہے۔

دریائے نیل کا پانی فرعونیوں کو خون نظر آیا تھا۔لیکن یہی خونی دریا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لیے پانی تھا۔ان کلمات کے مخالفین ظاہری نظر آتے ہیں، مگر ایسے لوگ ہی جہنم کا ایڈھن بنتے ہیں۔اگر آپ مردِ حق ہیں تو راز کی تلاش کرو، جانفشانی کرو، جگر سوزی کرو، اور حق تعالیٰ کو پالو۔

دل کو علائق وعوائق اور مشاغلِ دنیا سے پاک وصاف کرنے کے بعد تھوڑا سا غور کیا جائے، تو آپ کو باتوں کے ظاہری معانی سمجھ میں آنے لگیں گے۔اور اسی سمجھ سے حقیقی معانی کا انکشاف ہو جاتا ہے اور اجمالِ حقیقت حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس طائفہ کی باتیں علمِ وراثت کے عالَم سے آتی ہیں یہ ظاہری علوم سے حاصل نہیں ہوتی، یہاں تو ذوق کی زبان اور اشارات کے نشان سے کام لیا جاتا ہے، جب تک حقیقتِ حال کی شرح اس کے کانوں تک نہ پہنچی ہو، وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مخلوق کو اپنے میزان سے نہ تولا کرو، بلکہ اپنے آپ کو صدیقین کے میزان اور پیمانہ سے تولا کرو، تاکہ تمہیں ان کی فضیلت اور اپنے افلاس کا علم ہو جائے۔

جاننا چاہیے کہ جب حق تعالیٰ کسی بندۂ مومن پر انعامات وعنایات اور احسانات فرماتا ہے تو بسا اوقات اس کے اظہار و بیان کی اجازت ہوتی ہے وہ اپنی طرف سے

اظہار نہیں کرتے جب تک انہیں حکم و اِذن نہیں ہوتا اور اس میں بعض حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد: ﴿وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝﴾ یعنی (اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کیا کرو)۔

☆ گمراہ لوگوں کو راہ ہدایت پر لانے کے لیے اور دعوت وتبلیغ کے لیے حق تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا جاتا ہے اور حکمِ الٰہی کے تحت یہ حضرات ان نعمتوں کا اظہار کرتے ہیں، تاکہ سالکین و طالبوں کو روحانی فیض پہنچا سکیں، جس کا حصہ ان کے ہاتھوں لکھا ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو شرفِ قبولیت سے نوازے، اور ہمارے شیخ وسیلۂ نعمت حضرت مولانا اسماعیل واڈی صاحب نقشبندی مجددی رحمہ اللہ کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرمائے اور آپؒ کی مرقد انور کو بقعۂ نور بنائے۔

فقیر یوسف احمد نقشبندی مجددی
۲۶ شعبان ۱۴۳۴ھ مطابق
۵/جولائی ۲۰۱۳ء بروز جمعہ

اللہ

باسمہ تعالیٰ

حمد کثیر اور مبارک سب حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ جیسے کہ ہمارا رب پسند کرتا اور چاہتا ہے اور اس کے حبیب حضرت محمد ﷺ اور ان کی آل واصحاب اور اہل بیت اور کامل وارثوں اور تمام ہدایت کی راہ پر چلنے والوں اور تمام انبیاء اور مرسلین اور ملائکۂ مقربین پر کامل اور تمام صلوٰۃ وسلام ہو، جیسے کہ ان کی بلند شان کے لائق اور مناسب ہے۔

آغازِ تربیتِ سلوک:

جب یہ فقیر برطانیہ آیا تو حق تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک کامل بزرگ حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحب چشتی، صابری، نقشبندی مجددی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں رسائی حاصل ہوئی۔ آپؒ کی صحبت میں رہ کر مجھے سلوکِ چشتیہ اور نقشبندیہ اور ان سلسلۂ عالیہ کے بزرگوں کے طریقہ پر چلنے کی تربیت ملی۔ حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحبؒ کو چونکہ چشتیہ سلسلہ سے بھی خلافت حاصل تھی اور حضرت شیخؒ کا مزاج اور رنگ چشتیہ تھا، لیکن اس فقیر کو حضرت شیخؒ کی توجہ کی برکت سے خواجگان نقشبندیہ کا وہ جذبہ جو کمال سے پیدا ہوتا ہے ملا۔ نیز نہایت در بدائیت سے قدرے سیراب ہونے کا موقعہ ملا۔ اور خاندان نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگوار جو ہمارے شجرہ میں درج ہے، ان حضراتؒ کی روحانیت سے بھی فیض حاصل ہوا۔ الحمدللہ! جب یہ جذبہ پختہ ہوگیا تو مجھے سلوک میں اطمینان حاصل ہوگیا۔ اور حضرت شیخؒ کے روحانی فیض سے اور وساطت سے اس راہ کے تمام منازل طے ہوئے، یعنی مجھے

اس اسم تک رسائی حاصل ہوگئی جو میرا مرّبی یا پرورش کرنے والا تھا۔مقام در مقام جہاں تک حق تعالیٰ کو منظور تھا پہنچایا گیا۔ مجھے قطب ارشاد کی خلعت سے نوازا گیا۔

اسم مربی:

اسم مربی سے مراد اسماءِ الٰہیہ میں سے عالم وجوب کا فیض ہے،جس اسم کے ذریعہ سا لک کی تربیت کرتا ہے، اسے اس کا اسم مربی کہا جاتا ہے، اس کو مبدء فیض بھی کہتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ سالکین کو دورانِ سلوک جب مقاماتِ ولایت میں ترقی نصیب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا فیض اور تجلیات کا پرتو پڑتا ہے جنہیں مبادی فیوض کہا جاتا ہے اور ہر وَلی کا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں سے کوئی نہ کوئی اسم و صفت مبداءِ فیض ہوتا ہے۔

مختلف بزرگوں سے روحانی فیض ملنا:

شیخ الحدیث حضرت مولانا رضا اجمیریؒ کی روحانیت سے بھی فیض حاصل ہوا۔ حضرت مولانا اجمیریؒ سے اس فقیر کو محبت تھی، حضرت مولاناؒ راندیر گجرات میں مدرسہ اشرفیہ میں شیخ الحدیث تھے(۵۲)سال پڑھایا، حضرت شیخؒ کے مقام کو بتایا گیا راندیر کے کوئی بزرگ ان کے مقام تک نہیں پہنچا۔حضور نبی کریم ﷺ کی صدارت میں حضرت شیخ اجمیری صاحبؒ نے مجھے عالم کی سند عطا کی۔

مجھے نزول کے وقت جسے سیر عن اللہ باللہ کہا جاتا ہے حضرت پیر غلام حبیبؒ سے بھی روحانی فیض ملا۔اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے بھی اس فقیر پر شفقت فرمائی اور جو منصب مجھے دیا گیا اس کے لیے رہبری فرمائی۔ پھر مجھے دنیا کی طرف واپس کردیا گیا﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ واللّٰهُ ذُوْالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾۔

علمِ لدُنّی کا حصول:

حق تعالیٰ نے مجھے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا تو مجھے علم لدنی کا حصول اپنی ہی حقیقت سے ہونے لگا، یعنی اکثر علوم اپنی ذات میں خود بخود اپنی ذات سے حاصل ہونے لگے۔ کسی غیر کے واسطے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور مجھے عملیات کا علم دیا گیا اور اس کام پر مامور کیا گیا اور بتایا گیا کہ اس میں ایمان کی کافی خرابی پھیل گئی ہے، تو بندوں کا یقین حق تعالیٰ کے ساتھ جوڑنا، عملیات کے بارے میں ہم نے اپنی کتاب "**تَربِیَۃُ السَّالِکِین**" میں تفصیل سے لکھ دیا ہے "وَالسَّلامُ عَلیٰ مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی"۔

قطب الارشاد اور اس کا فیض:

یہ مقام بہت کم حضرات کو ملتا ہے، صدیوں کے بعد اور ہزاروں میں سے ایک شخص کو اس مقام پر فائز فرماتے ہے، اس کے واسطے سے ایمان اور معرفت کی روشنی ملتی ہے۔ جو شخص قطب ارشاد کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا اخلاص رکھتا ہے یا قطب ارشاد خود کسی کی طرف توجہ دیتا ہے تو اس کے دل کے دروازے کھل جاتے ہیں، وہ اپنے اخلاص اور طلب کی حقیقت سے اپنا حصہ لیتا جاتا ہے اور اس دریا سے سیراب ہوجاتا ہے۔ بعض بزرگ جو ذکرِ الٰہی میں مشغول ہے، لیکن مقامِ قطب الارشاد سے واقف نہیں ہوتے اور وہ اس کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہوتے ہیں، ان کی یہ بے توجہی یا محرومی کسی انکار یا تکبر سے نہیں ہوتی۔ بلکہ مقام قطب الارشاد سے ناواقفیت کی بنا پر ہوتی ہے، اس بزرگ کو بھی قطب الارشاد سے ایسے ہی حصہ ملتا رہتا ہے، جس طرح بارانِ رحمت سے تمام مقامات سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فیض یابی ان لوگوں کے لیے خصوصی ہوتی ہے جو مقامِ قطب الارشاد سے واقف ہوتے ہوئے توجہ اور طلب فیضان کرتے رہتے ہیں۔

بعض لوگ قطب الا رشاد کے مقام کے منکر ہوتے ہیں، وہ اپنے عجب وتکبر کی وجہ سے قطب الا رشاد کو خاطر میں نہیں لاتے ایسے لوگ کتنے ہی ذکرِ الٰہی میں مشغول رہیں، رشد وہدایت کی حقیقت سے محروم رہتے ہیں،خواہ قطب الا رشاد اسے بھی کوئی نقصان نہ پہچائے یا ارادہ نقصان بھی نہ کرے،لیکن وہ شخص اپنے کردار کی وجہ سے رشد وہدایت سے محروم رہتا ہے، ظاہری طور پر اُسے کچھ چیزیں میسّر بھی آجائیں مگر وہ رشد حقیقی سے یکسر خالی رہتا ہے۔

ان حضرات کو بھی بیوی بچوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ولایت اور محبت خداوندی انہیں ان ضروریات سے فارغ نہیں کرتیں، وہ دوسرے لوگوں کی طرح غصّہ بھی کرتے ہیں اور اسی طرح محبت وشفقت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔سیّدالبشر حضرت محمد ﷺ فرماتے ہیں "أَغْضُبُ كَمَا يَغْضبُ البَشَر" یعنی (مجھے بھی اس طرح غصّہ آتا ہے جس طرح دوسرے لوگوں کو آتا ہے) جب حضور ﷺ کو غم وغصّہ کے جذبات سے بے نیاز قرار نہیں دیا جا سکتا تو اولیاء اللہ کیسے دور رہ سکتے ہیں۔اسی طرح یہ بزرگ کھانے پینے،اہل وعیال سے تعلقات،معاشرت وموانست کی دوسری کیفیتیں ان پر بھی طاری ہوتی ہیں، بشریت کے تمام تعلقات اورعوامل خواص وعوام میں موجود ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ ﴿ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ﴾ یعنی (اور ہم نے ان کے ایسے اجسام نہیں بنائے کہ وہ کھانا کھانے سے بے نیاز ہوجائیں) ایسے ہی حالات میں کفار مکہ کہا کرتے تھے ﴿ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلُ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِيْ الْأَسْوَاق ﴾ یعنی (اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ وہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے) ان کفاروں کی نظریں نبی ﷺ کے ظاہری معاملات پر پڑیں اور ان کی سوچ وہاں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی اور وہ دنیا وآخرت کے خسارہ میں پھنس گئے، یہی ظاہر بینی تھی، جس نے ابوجہل اور

ابولہب کو ایمان کی دولت سے محروم رکھا اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارہ میں رکھا
" وَالسلام علیٰ منِ اتَّبَعَ الْھُدیٰ " ۔

ذوقِ یافت:

پہلے پہلے جو دروازہ میرے لیے کھولا گیا وہ یافت کا ذوق تھا، نہ کہ یافت بعد ایک وقت آیا کہ یافت کی دولت نصیب ہوئی تو ذوق یافت مفقود ہو گیا، تیسرے درجہ پر یافت بھی ذوق یافت کی طرح مفقود ہو گئی۔

مراتبِ سلوک:

دورانِ سلوک سالک کو تین قسم کے مراتب پیش آتے ہیں: (۱) ذوقِ یافت (۲) یافت (۳) فقدِ یافت۔

(۱) ذوقِ یافت: ذوق کا معنی چکھنا اور یافت کا معنی پانا ہے۔ جب سالک کے قلب میں اخلاص کے ساتھ حق تعالیٰ کا قرب وحضوری پانے اور بارگاہِ قدس تک رسائی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جائے، تو اسے ذوقِ یافت کہتے ہیں۔

ذوق یافت کے حاملین کو ابرار کہا جاتا ہے، جس کا معنی ہیں صالحین۔

(۲) یافت: جب سالک کو حق تعالیٰ کا قرب اور حضوری نصیب ہو جائے اور بارگاہِ قدس تک اس کی رسائی ہو جائے تو اسے یافت کہتے ہیں۔ یہ مقربین کا مرتبہ ہے۔

(۳) فقدِ یافت: جب طالب صادق بارگاہِ قدس تک پہنچ جاتا ہے تو وصال کے بعد فراق، عروج کے بعد نزول کا مرتبہ آتا ہے اس درجہ میں یافت گم ہو جاتی ہے، اس لیے اسے فقدِ یافت کہا جاتا ہے۔

یہ رشد و ہدایت اور دعوت وتبلیغ کا مرتبہ ہے جسے مقامِ تکمیل بھی کہا جاتا ہے، اس نزولی مرتبہ میں صوفی کو اس لیے نیچے بھیجا جاتا ہے، تاکہ جس رستے سے وہ واصل بحق

ہوا ہے، اسی رستے سے اور لوگوں کو حرم یار تک پہنچائے۔ جن سالکین کو دورانِ سلوک کمالات ولایت کے آخری درجہ تک جس قدر رسائی میسر ہوتی ہے، رجوع کے وقت اسی قدر نزول نصیب ہوتا ہے۔

مقامِ دعوت وارشاد اور حضرات نقشبندیہ:

اس مرتبہ میں صوفی اور سالک رجوع کے بعد خلق خدا کی تعلیم و تربیت کے فرائض کی انجام دہی پر مامور ہوتا ہے اور قافلوں کے قافلے حرم یار تک پہنچا تا ہے۔ جب ذوق یافت والے سالک کو کوئی شیخ کامل میسر آجائے جو اسے راہ سلوک پر گامزن کر دے اور عروجی منازل میں برابر رہنمائی ملتی رہے تو اس کا جذب سلوک کے ساتھ مل جاتا ہے، لہٰذا اب وہ مجذوب سالک کہلوائے گا۔

سالک اور مجذوب کے مختلف درجات:

ایسا سالک جسے جذبہ تو میسر ہو، مگر وہ سلوک سے محروم ہو اُسے نہ تو ولایتِ خاصہ کا مرتبہ نصیب ہوتا ہے اور نہ ہی اسے مقام تکمیل حاصل ہوتا ہے، اس لیے وہ تعلیم وتربیت اور رشد و ہدایت کے منصب کا اہل نہیں ہوتا۔

(۱) ایسا صوفی جسے وصال یار کے بعد لوگوں کی تربیت و ہدایت اور دعوت وتبلیغ کے لیے واپس عالم خلق کی طرف لوٹا دیا جائے، اسے کامل مکمل سالک کہا جاتا ہے، اسی کو مجذوب سالک بھی کہتے ہیں، اور یہی افضل مرتبہ ہے، جسے نبوت و رسالت کی نیابت وخلافت حاصل ہے۔

(۲) ایسا صوفی جس کے جذبہ پر اس کا سلوک مقدم ہو اسے سالک مجذوب کہا جاتا ہے، گو یہ بھی دعوت وتبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتا ہے، مگر اس کی توجہات مجذوب سالکین اور محبوبین کے لیے کافی نہیں ہوتی۔

(۳) جو سالک محض مجذوب ہو یا فقط سالک ہو وہ خود کامل نہیں ہوتا فلہٰذا دوسروں کی تکمیل بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ناقص ہے، وہ نہ کامل ہے نہ مکمل تم نے کم ہمت نہ بننا۔ والسلام علیٰ خیر البشر سیدنا محمد و آلہ الاطہر۔

ماہ شوال ۱۴۲۰ھ کے آخری دنوں (فروری ۲۰۰۰ء) میں مجھے خانوادہ نقشبندیہ کے ایک ممتاز بزرگ خلیفہ اور قطب برطانیہ حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحب چشتی ،نقشبندی مجددی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے دستِ حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوا اور حضرت شیخؒ کی زیرِ نگرانی سلوکِ نقشبندیہ طے کرنا شروع فرمایا۔اس سے پہلے یہ فقیر جب ہندوستان میں تھا چودہ سال کی عمر ہوگی اس وقت حق تعالیٰ کی کریم ذات نے اس ناکارہ کو محبت و جذب کی راہ سے کھینچ کر دنیا کے چکر سے نکالا اس وقت دنیا سے بے رغبتی ہو گئی تھی ، اور قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ اور اس سلوک کی راہ میں پیر و شیخ ظاہر کی حاجت ہوگی تو کوشش کے بغیر اس دولت کی طرف رہنمائی ہوئی اور حق تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے اس فقیر کو یہ شیخ کی دولت کے لیے ہی برطانیہ پہنچایا گیا اور حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحب چشتی ،نقشبندی مجددی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے شیخ و رہنما اور ان کے جیسا روحانی فیض کی مجھ جیسے ناکارہ کو ضرورت تھی تو مجھے برطانیہ پہنچایا گیا۔حضرت شیخؒ صاحبِ کشف بزرگ تھے، اگر کوئی طالب و سالک حضرت شیخؒ کی صحبت میں صحیح عقیدت کے ساتھ جاتا تو اس کا کام بن جاتا۔ ہر مرید اپنی لیاقت کے موجب علیحدہ علیحدہ عقیدت رکھتے تھے اور اسی کے موجب ہر ایک فیضیاب ہوا۔ چنانچہ میرا عقیدہ یہ تھا کہ بعد زمانہ حضور نبی کریم ﷺ ایسی صحبت اور تربیت و ارشاد سوائے حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحب نقشبندی مجددی رحمہ اللہ کے کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی۔ ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھ کو میرے اعتقاد کے بموجب فیضان حاصل ہوا" اللّٰھم لك الحمد ولك الشكر "۔

حضرت شیخ مولانا اسماعیل واڈی صاحب نقشبندی مجددی رحمہ اللہ تعالیٰ کی وفات حسرت ۵ رمحرم الحرام ۱۴۳۴ھ مطابق ۱۹ نومبر ۲۰۱۲ء کو مغرب کے وقت ہوئی، حق تعالیٰ حضرت شیخ ؒ کو ہماری طرف سے بہترین جزائے خیر عطا فرماوے اور ان کے درجات کو بلند فرماوے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماوے۔ آمین

اور حضرت شیخ ؒ کی زیر تربیت میں تفصیلی سلوک پانچ سال میں طے کرنے کے بعد آغاز میں وہ انتہا (نہایت) جو ابتدا (بدایت) ہی میں بے شمار ابتداؤں اور اوساط کے پردوں کے پیچھے سے جلوہ گر ہوئی۔ جب جذبۂ نہایت حاصل ہوا، حقیقت کار کھل کر سامنے آئی اور علم الیقین سے حق الیقین تک رسائی نصیب ہوگئی تو اس بات کا علم ہوگیا کہ اسم اور مسمّٰی، صورت اور حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے۔ کام کی حقیقت یہاں آکر کھلی اور معاملہ کا بھید اس جگہ ظاہر ہوا، جس نے چکھا نہیں اسے معلوم نہیں ہوا۔
وَالصَّلوٰ ةُ وَالسَّلا مُ علیٰ سید الأنبیاء ﷺ۔

نسبتِ نقشبندیہ:

نسبتِ نقشبندیہ کی بلندی وفوقیت کا راز اندراج النہایت فی البدایت ہے یعنی جو جذبہ دوسرے سلاسل طریقت میں انتہا میں عطا فرمایا جاتا ہے وہ اس سلسلہ کے سالکوں کو ابتداء میں ہی دے دیتے ہیں ان بزرگوں کے نزدیک جذبہ دو قسم پر ہے: جذبۂ بدایت اور جذبہ نہایت۔

اس سلسلہ میں جذبۂ بدایت سالک کو ابتداء میں اس لیے دیا جاتا ہے، تاکہ طالب جذبہ کی لذت چکھے بغیر مر نہ جائے۔

نسبت علاقہ بین الطرفین کو کہا جاتا ہے، یعنی حق تعالیٰ اور بندۂ مؤمن کے

درمیان طریقت کے اعتبار سے تعلق کونسبت کہتے ہیں ۔ ہر سلسلۂ طریقت کا حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق مختلف ہوتا ہے، کسی کا تعلق وصل کا ہے، کسی کا تعلق درد کا ہے، کسی کا تعلق محبت کا ہے، کسی کا تعلق عشق کا ہے، کسی کا تعلق اضطراب کا ہے، کسی کا تعلق سکون کا ہے طریقتِ نقشبندیہ کا تعلق حضور کا ہے " وَالحمد للّٰہ علی ذلك " ۔

سیر کی اقسام:

جاننا چاہیے سیر دوطرح کی ہوتی ہے: (۱) سیر آفاقی (۲) سیر انفسی ۔

سیر آفاقی: یہ ہے کہ مقصود کو اپنے دائرہ سے باہر تلاش کیا جائے ، یہ سیر بُعد در بُعد ہے ۔

سیر انفسی: یہ ہے کہ اپنے قلب کے گرد گھومنا اور اپنے اندر ہی مقصود کو تلاش کرنا ، یہ سیر قرب در قرب ہے ۔

جب سالکین کسی شیخ کامل کے زیرِ نگرانی سُیو رِ اَربعہ جس کو ہم نے اپنی کتاب " تَربیَۃُ السّالِکین" میں لکھ دیا ہے، وہ طے کرتے ہیں، ان میں سے کسی کو تفصیلی سیر کروائی جاتی ہے، اور کسی کو اجمالی سیر کروائی جاتی ہے، جن سالکین کی سیر اجمالی ہوتی ہے انہیں مراد کہا جاتا ہے ۔

ہر سالک کو حق تعالیٰ کے کسی نہ کسی اسم سے فیض پہنچتا ہے ۔ وہ اسم اس سالک کا مبداءِ فیض یا مبداءِ تعین یا اسم مربی کہلاتا ہے ۔

جب کسی صوفی کو بذریعہ کشف وشہود اپنا مبداء فیض معلوم ہو جائے ، تو اسے عارف کہتے ہیں ، چونکہ حق تعالیٰ کے اسماء کی کوئی حد نہیں اور حق تعالیٰ کا ہر اسم کائنات کو تجلیات کے ذریعہ فیض دیتا ہے، اس لیے اس کی تجلیات کی بھی کوئی حد نہیں ۔

فیض کی دو قسمیں:

سالک کو ذاتِ حق تعالیٰ (مبداء فیاض) سے جو فیض پہنچتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں:
(۱) فیض تخلیقی (۲) فیضِ کمالاتی۔

فیضِ تخلیقی: انسان کی ایجاد و تخلیق کا سبب فیض تخلیقی کہلاتا ہے۔ یہ فیض انسان کو صفات کے توسّط سے حاصل ہوتا ہے۔

فیضِ کمالاتی: انسان کا ایمان و معرفت اور کمالاتِ نبوّت و ولایت کا سبب فیض کمالاتی کہلاتا ہے۔ یہ فیض بعض کو صفات کے توسّط سے اور بعض کو شیونات (شان کی جمع ہے) کے توسّط سے حاصل ہوتا ہے۔

کمالاتِ ولایت کے درجات:

جب اولیاءِ کرام کو کمالاتِ ولایت میں سیر نصیب ہوتی ہے تو ان کی باطنی استعداد کے مختلف ہونے کی بنا پر ان کے درجات میں تفاوت ہوتا ہے۔ بعض میں صرف ایک درجہ ولایت کی استعداد ہوتی ہے، بعض میں دو کی استعداد ہوتی ہے، بعض میں تین اور بعض میں چار کی۔ اور بعض گنے چنے اولیاء اللہ پانچ کمالات کی استعداد رکھتے ہیں، مگر ایسے افراد کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ان پانچ درجوں میں سے پہلا درجہ تجلّیٔ افعال سے وابستہ ہے۔ دوسرا درجہ تجلّیٔ صفات سے وابستہ ہے اور باقی کے تینوں درجے تفاوتِ درجات کی بنا پر تجلیاتِ ذاتی سے وابستہ ہوتے ہیں۔

تجلّی کا مفہوم:

تجلّی کسی شے کے منکشف اور ظاہر ہونے کا نام ہے۔

☆ تجلی کے معنی ہیں چمکنا ،ظاہر ہونا ،منکشف ہونا ،اصطلاح صوفیاء میں کسی شئی کا دوسرے مرتبے میں ظاہر ہونے کا نام تجلی ہے۔

☆ غیبی انوار کے دلود پر منکشف ہونے کا نام تجلی ہے۔

حق تعالیٰ جب بندہ پر تجلی فرماتے ہیں تو اس کا نام حق کے اعتبار سے شانِ الٰہی رکھا جاتا ہے اور بندہ کے اعتبار سے اسے حال کہا جاتا ہے اور وہ ہر آن ایک نئی تجلی میں ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ کا تجلی فرمانا:

حق تعالیٰ مختلف درجات اور مختلف ظہورات میں تجلی فرماتا ہے جب وہ افعال کے ذریعہ تجلی فرماتا ہے،تو اسے تجلی فعلی کہا جاتا ہے۔

☆ جب وہ اسماء وصفات کے ذریعے متجلی ہوتو اسے اسمائی یا صفاتی تجلی کہا جاتا ہے۔

☆ جب وہ اپنی ذات کا ظہور فرمائے تو اسے تجلی ذاتی کہا جاتا ہے۔

چونکہ حق تعالیٰ کے ظہور کی شانیں بے انتہا ہیں ،لہٰذا تجلیات بھی لا تعداد ہیں، ہر شخص پر اس کی استعداد کے مطابق جداگانہ تجلیات ہوتی ہیں، جو تجلی ایک شخص پر ایک مرتبہ ہوتی ہے وہ پھر دوبارہ اس پر یا کسی اور پر کبھی نہیں ہوتی ،کیونکہ تجلیات میں تکرار نہیں ہر دم، ہر لحظہ اور ہر آن وہ نئی نئی شان میں تجلی فرماتا رہتا ہے ﴿ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْن ﴾ (ہر روز اس کی نئی شان) جس طرح اس کی ذات لا متنا ہی ہے، اسی طرح اس کی تجلیات بھی حدوحصر سے باہر ہیں۔

تجلیٔ افعال:

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو صفات فعلیہ ربوبیت میں سے کسی صفت کے

ساتھ متجلی پاتا ہے، اس مشاہدہ میں سالک سے حول وقوت اور فعل وارادہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز میں حق تعالیٰ کی قدرت کو جاری ومتصرف دیکھتا ہے۔

تجلئ صفات:

اس تجلی میں سالک حق تعالیٰ کو اُمہاتِ صفات میں متجلی پاتا ہے، اُمہاتِ صفات آٹھ ہیں، ان کو صفاتِ ثمانیہ حقیقیہ بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) تکوین (۲) حیات (۳) علم (۴) قدرت (۵) ارادہ (۶) سمع (۷) بصر (۸) کلام۔

تجلی ذات:

اس تجلی میں سالک فنائے مطلق کے بعد اپنے علم، شعور اور اِدراک سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور محبتِ ذاتی سے مشرف ہو جاتا ہے، اس کے تمام لطائف ما سویٰ اللہ کو فراموش کر کے مقامِ کمال تک پہنچ جاتے ہیں۔ پس! عبد فانی ہو جاتا ہے اور حق باقی رہتا ہے اور اس پر حقیقت اخلاص ظاہر ہو جاتی ہے، تو اس وقت تجلئ ذات کا نزول ہوتا ہے، اس تجلی میں سالک اپنے آپ کو بلاتعین جسمانی و روحانی اطلاق کے رنگ میں پاتا ہے اور کمال توحید عیانی کا مشاہدہ کرتا ہے، اسی کو وصلِ عریانی کہا جاتا ہے، یعنی اسماء وصفات کے اعتبارات اور حجابات اس مقام میں سالک و عارف کے سامنے حائل نہیں رہتے ہیں۔

تجلی ذاتی کی قسمیں:

تجلی ذاتی کی دو قسمیں ہیں: (۱) تجلی ذاتی برقی (۲) تجلی ذاتی دائمی۔

تجلی ذاتی برقی:

اکثر مشائخ طریقت کے نزدیک تجلی ذاتی، برقی ہوتی ہے، یعنی آسمانی بجلی کی طرح تھوڑی دیر کے لیے سالکین کے سامنے سے اسماء وصفات کے حجابات دور ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد دوبارہ حائل ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان پر حضور ذاتی کا اثر کم اور غیبت (غائب، چھپانا) کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔

تجلی ذاتی دائمی:

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ رحمہم اللہ کے نزدیک تجلی ذاتی دائمی ہوتی ہے، یعنی جب تجلی آتی ہے تو پھر جاتی نہیں ہمیشہ رہتی ہے سلسلۂ نقشبندیہ میں اس کو نسبت حضور وآگاہی، حضور ذاتی دائمی، دوام حضور مع اللہ بلاغیبت اور یادداشت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ تجلی ذاتی دائمی حضراتِ نقشبندیہ کا خاصہ ہے، تاہم دیگر سلاسل طریقت کے اکابر مشائخ بھی اس تجلی سے شادکام ہوتے ہیں۔

تجلی ذاتی برقی میں ولولہ اور جوش ہوتا ہے حضراتِ چشتیہ پر جب یہ تجلی ظاہر ہوتی ہے، تو ان کی آتش عشق شعلہ زن ہوتی ہے جس کا اظہار وجد، شور وغوغا اور چیخ وپکار کی صورت میں ہوتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ بعض نقشبندی حضرات وجد، شور وپکار اور ذکر جہر شروع کر دیتے ہیں اس کی وجہ نسبتِ نقشبندیہ کا دیگر نسبتوں کے ساتھ اختلاط اور التباس ہوتا ہے، وہ نقشبندی ہونے کے ساتھ ساتھ قادری اور چشتی نسبتوں کے حامل بھی ہوتے ہیں، اس لیے ان پر کبھی نسبتِ چشتیہ کا غلبہ ہوجاتا ہے اور کبھی نسبتِ قادریہ کا غلبہ ہوجاتا ہے، ان کے رنگ اور ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔

جبکہ خالص نسبتِ نقشبندیہ میں مکمل طور پر سکون وقرار اور سکوت ہے، اس لیے ان کی آتش عشق شعلہ نہیں مارتی، بلکہ خاکستر کے نیچے چنگاری کی طرح سلگتی رہتی ہے بجھتی نہیں۔

وہی آبلے ہیں وہی جلن کوئی درد دل میں کمی نہیں
جو لگا کے آگ چلے گئے وہ لگی ہوئی ہے بجھی نہیں

طریقہ میں نئی باتیں:

آج کل خالص نقشبندی حضرات نے بھی اس طریق میں نئی نئی باتیں نکالی ہیں اور ان بزرگواروں کے اصل راستہ کو ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ان کے بعض مشائخ اور پیروں کا یہ اعتقاد ہے کہ ان نئی نئی باتوں نے اس طریقہ کو کامل کر دیا ہے۔ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہے ﴿ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ﴾ (منہ چھوٹا اور بڑی بات)، بلکہ انہوں نے اس کے خراب اور ضائع کرنے میں کوشش کی ہے۔

جان لیں! کہ حضرت خواجگان قدس سرہم کا طریقہ حق تعالیٰ کی طرف پہنچانے والے سب راستوں سے زیادہ قریب راستہ ہے اور دوسروں کی انتہاء ان بزرگواروں کی ابتداء میں درج ہے اور اُن کی نسبتوں سے بڑھ کر ہے، اس کا باعث یہ ہے کہ اس طریقہ میں سنت کو لازم پکڑتے ہیں اور بدعت سے بچتے ہیں اور حتی المقدور رخصت پر عمل جائز نہیں کرتے، اگرچہ بظاہر باطن میں فائدہ دینے والا ہو اور عزیمت پر عمل کرنا نہیں چھوڑتے، اگر بظاہر باطن میں مضر جانیں انہوں نے احوال ومواجید کو احکامِ شرعی کے تابع کیا ہے، اور ذوق و معارف کو علومِ شرعیہ کے خادم سمجھتے ہیں۔اور صوفیہ کی بے ہودہ باتوں پر مغرور اور فریفتہ نہیں ہوتے۔

افسوس ہزار افسوس اس طریقۂ عالیہ کے کچھ لوگ حضرت خواجہ بہا ؤالدین نقشبندؒ کی مزار پر جا کر بھی ذکر جہر کرتے ہے، حالانکہ حضرت خواجہ بہا ؤالدین نقشبندؒ سے ہی ذکر جہر سے منع کر دیا گیا۔اور جو مراقبہ ہے بعض حضرات پورا مراقبہ اشعار پڑھ کر ختم کر دیتے ہے، مراقبہ کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہی نہیں ہوتا۔مراقبہ کا معنی ہیں حق تعالیٰ کی رحمت کے انتظار میں بیٹھنا، نہ کہ پورے مراقبہ میں اشعار پڑھنا۔ایک،دو اشعار پڑھے کوئی حرج نہیں ۔مراقبہ کی مداومت نادر چیز ہے، جس کو کما حقہ کم لوگوں نے حاصل کیا ہے۔وہ نسبتِ شریفہ عنقائے مغرب ہوگئی ہے اور بالکل پوشیدہ ہوگئی ہے، اسی طریق کے لوگوں میں سے ایک جماعت نے اس دولت عظمیٰ کے نہ پانے اور اس نعمتِ اعلیٰ کے گم ہونے سے ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، جو ہر نفسیہ کو چھوڑ کر ٹھیکریوں پر خوش ہوئے ہیں اور نہایت بےقراری اور حیرانی سے اپنے بزرگوں کے طریق کو چھوڑ کر کبھی ذکر جہر سے تسلی حاصل کرتے ہیں اور کبھی سماع و رقص سے آرام ڈھونڈتے ہیں اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسی بدعتوں کو اس نسبتِ شریفہ کی متمم اور مکمل خیال کرتے ہیں اور اس بربادی کو عین آبادی گنتے ہیں ۔حق تعالیٰ ان کو انصاف عطا کرے اور اس طریقہ کے بزرگواروں کے کمالات کی خوشبو ان کے دماغ میں پہنچائے۔ان کا حال دائمی ہے اور ان کا وقت استمراری تجلی ذاتی جو اوروں کے لیے بجلی کی طرح ہے اِن بزرگواروں کے لیے دائمی ہے۔وہ حضور جس کے پیچھے غیبت ہو ان بزگواروں کے نزدیک بے اعتبار ہے۔

لیکن ہر ایک کا فہم ان بزرگواروں کے مذاق تک نہیں پہنچتا، بلکہ نزدیک ہے کہ اس سلسلۂ عالیہ کے قاصر اور کم ہمت لوگ بھی ان بزرگواروں کے بعض کمالات سے انکار کر دیں۔

کرے اگر طعن کوئی پست ہمت اس طریقے پر
پناہ دے رب اگر لاؤں زباں پر کچھ گلہ اس کا

اور چونکہ اس قسم کی بدعتیں اس طریقۂ عالیہ نقشبندیہ میں یہاں تک پھیلی ہوئی ہیں کہ بزرگواروں کے اصل طریق کو پوشیدہ کر دیا ہے اور ہر شریف وخسیس نے نئی اور جدید وضع اختیار کر لی ہے اور اصل اور قدیم طریق کی طرف سے منہ پھیر لیا ہے، اس لیے دل میں گزرا کہ تھوڑا سا یہ ماجرا ظاہر کرے اور اس وسیلہ سے اپنے درد دل کو نکالے، حق تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

سالک کا نزول:

نہایت النہایت کے واصلین وسالکین کو دورانِ سلوک کمالاتِ ولایت کے آخری درجہ تک جس قدر رسائی میسر ہوتی ہے رجوع کے وقت اسی قدر نزول نصیب ہوتا ہے، عروج کے انتہائی درجہ کو نہایۃ النہایت اور نزول کے انتہائی درجہ کو غایۃ الغایت کہا جاتا ہے، جو سالک عروج میں جتنا کامل ہوگا نزول میں بھی اتنا ہی کامل ہوگا، یعنی جس سالک کا عروج کامل ہوتا ہے اس کا نزول بھی کامل ہوتا ہے اور جس صوفی اور سالک کا عروج ناتمام اور ناقص ہوتا ہے اس کا نزول بھی ناتمام اور ناقص ہوتا ہے، یعنی وہ نہ عروج میں درجہ کمال تک رسائی حاصل کر پاتا ہے اور نہ ہی نزول میں اسے کمال نصیب ہوتا ہے۔

توجہ الی الطرفین:

جن سالکین کو بارگاہِ حق تعالیٰ تک پورا پورا وصل نصیب ہو جاتا ہے، رجوع کے وقت واپسی پر وہ عالمِ اسباب کی طرف کلیۃً متوجہ ہوتے ہیں، اور جو سالک عالمِ خلق

کی طرف مکمل طور پر متوجہ نہ ہوں ، بلکہ ان کی کچھ توجہ عالمِ بالا کی طرف ہو اور کچھ توجہ عالمِ اسباب کی طرف ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسے عروجی منازل میں نہ تو نہایۃ النہایت تک وصال میسر ہوا ہے اور نہ ہی نزولی مراتب میں غایۃ الغایت تک نزول نصیب ہوا ہے، یعنی یہ اس کے ناقص اور عدمِ وصول کی علامت ہے۔

سابقہ کلام کا ماحصل یہ ہے کہ وہ سالک جس کا عروج ونزول کامل ہو، اس کے لطائف کو حالتِ نماز میں حق تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص قسم کی توجہ حاصل ہوتی ہے اور ادائے نماز کے بعد وہ کلیۃً مخلوق کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، یہی واصلِ نہایت اور نازلِ غایت کی علامت ہے۔

لطائفِ ستّہ:

جب سالک ،واصل ، کامل فرائض اور سنتیں ادا کرتا ہے تو اس کے چھ کے چھ لطائف بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔ چھ لطائف سے مراد عالمِ امر کے پانچ لطائف : قلب ،روح ،سر،خفی ، اخفی اور لطیفہ قالبیہ ہیں ۔ان لطائف کا بیان ہم نے اپنی کتاب "تَربِیَّۃُ السَّالِکِیْن" میں کر دیا ہے۔جنہیں لطائفِ ستہ کہا جاتا ہے۔

ادائے نوافل کے دوران سارے لطائف حق تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ، بلکہ لطائفِ ستہ میں سے جو لطیف ترین لطیفہ ہے وہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، بقیہ لطائف اِدھر ہی رہتے ہیں ۔اولیائے کرام کی باطنی استعداد اور روحانی قابلیت کی بنا پر ان کے لطائف کی لطافت متفاوت اور مختلف ہوتی ہے ۔دوسرے مشائخ نے اس کمال کو جمع بین التوجہین میں جانا ہے۔ہم اپنا کام اور معاملہ حق تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں ، اس شخص پر سلامتی ہو جس نے ہدایت کی پیروی کی اور جناب نبی کریم ﷺ کی

فرمانبرداری اور تابعداری کی۔

مشاہدہ:

کسی امر کے استحضار اور یقینی تصور کا قلب سالک پر اس طرح غالب اور قوی ہو جانا کہ گویا وہ دل کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا ہے مشاہدہ کہلاتا ہے۔جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں جب دوزخ وجنت کا ذکر سنتے تو یوں معلوم ہوتا، جیسے ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں''۔

وجوب کے مرتبہ میں سالک کو دو قسم کا مشاہدہ ہوتا ہے کبھی صفات بدونِ تعلقات اس کی نظر میں بعنوان کلیت مشہود ہوتی ہیں اور کبھی صفات متعلق بہ معلومات ومقدورات بعنوان جزئیت نظر آتی ہیں۔

قسم اول:

پہلی قسم کے مشاہدہ کو شہودِ صفاتِ کلیہ کا نام دیتے ہیں۔اس مرتبہ میں صفاتِ مجردہ مشہود ہوتی ہیں، ان کا ممکنات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

قسم دوم:

دوسری قسم کو شہودِ صفاتِ جزئیہ کہا جاتا ہے۔اس مرتبہ میں صفات کا ممکنات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور سالک مشاہدہ کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتِ علم فلاں معلوم کے ساتھ اور صفتِ قدرت فلاں مقدور کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، علیٰ ہذا القیاس تمام صفات، ممکنات سے متعلق نظر آتی ہیں۔

مشاہدۂ انفس و آفاق:

تصوف وطریقت کی یہ اصطلاحات آیت قرآنی: ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِيْ الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ﴾ یعنی (ہم انہیں آفاق ونفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے) سے ثابت ہے۔

مشاہدۂ انفس:

سیر انفسی کے دوران ولایتِ صغریٰ (ولایتِ ظلیہ) تک رسائی کے حصول کے بعد سالک کا اپنے اندر انوار وتجلیات دیکھنا، مشاہدۂ انفس کہلاتا ہے، لہٰذا مطلوبِ حقیقی کو اپنے اندر ڈھونڈنا چاہیے۔

مشاہدۂ آفاق:

اثنائے راہ سیر الی اللہ کے دوران عروجی منازل میں سالک کا اشیائے کائنات کی شکلوں اور صورتوں میں حق تعالیٰ کی قدرت کے آثار اور انوار وتجلیات دیکھنا مشاہدۂ آفاقی کہلاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ نہ مشاہدۂ آفاقی معتبر ہے اور نہ ہی مشاہدۂ انفسی قابل اعتبار ہے، لہٰذا جس وقت سالک کمالاتِ ولایت نبوت سے مشرف ہوتا ہے، تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شہودِ انفسی بھی ظلال مطلوب میں سے ایک ظل ہے اور مطلوب حقیقی ابھی ماوراء ہے۔

یہی معرفتِ حقیقت اور شریعت کے عین مطابق ہے، کیونکہ شہودِ آفاق وانفس ظلال کے ساتھ مربوط ہے اور آفاق وانفس اصل کے وصل کی لیاقت نہیں رکھتے۔

پس! لامحالہ وہ سیر جو سالک کو آفاق وانفس کی سیر کے بعد میسر آتی ہے، اس سیر کا تعلق ظلال کی بجائے اصل کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کو سیر اقربیت کہا جاتا ہے، جس کا مدلول آیت قرآنی: ﴿ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد ﴾ یعنی (اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں) ہے۔ جہاں مطلوب لباس، وہم وخیال سے منزہ مشہود ہوتا ہے اور یہ مرتبہ وصل عریانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پس! جو کچھ آفاق وانفس کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے، لازماً نفی کے لائق ہے، تاکہ اصل کا اثبات واضح ہو جائے اور جب معاملہ آفاق وانفس سے گذر کر ظلیت کی قید سے خلاصی پا لیتا ہے تو منتہی سالکوں کو جو دائرۂ ظل سے نجات پا چکے ہیں تجلی برقی میسر آتی ہے، جو مرتبہ اصل سے تعلق رکھتی ہے اور ایک ساعت کے لیے سالک کو برق کی طرح آفاق وانفس سے رہائی دلاتی ہے، اور وہ حضراتِ نقشبندیہ جو دائرۂ آفاق وانفس سے گذر کر ظل سے اصل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، یہ تجلی برقی ان کے لیے دائمی ہو جاتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ حق تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں بالکل یگانہ ہے، اس کی ذات وصفات مخلوق کی ذات وصفات سے قطعاً مختلف ہیں، اور کسی طرح ان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں، چونکہ حق تعالیٰ بے مثل اور بے کیف ہے، اس لیے وہ مماثلت اور کیفیت کے آئینوں سے وراء ہے۔

آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ:

آخرت میں مؤمنوں کے لیے حق تعالیٰ کا دیدار ہونا حق ہے، یہ وہ مسئلہ ہے کہ سوائے اہل سنت وجماعت کے دوسرے اسلامی فرقوں اور حکمائے فلاسفہ میں سے کوئی شخص بھی اس کے جواز کا قائل نہیں ان کے انکار کی وجہ، غائب کو حاضر پر قیاس

کر لینا ہے، جو ہر حال فاسد و غلط ہے۔ نظر آنے والی ہستی جبکہ بے مثل اور بے کیف ہوگی، جو رؤیت (دیدار) اس متعلق ہو وہ بھی بے مثل اور بے کیف ہوگی۔ اس پر ایمان لانا چاہیے، مگر اس کی کیفیت میں مشغول نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کس طرح اور کیونکر ہوگی، قدرت نے اس راز کو آج بھی خواص اولیاء پر ظاہر فرمایا ہوا ہے، جو کچھ اِنہیں مشاہدہ ہوتا ہے، وہ اگر چہ رؤیت (دیدار) نہیں ہے، لیکن وہ بے رؤیت بھی نہیں ہے۔ گویا کہ تم ذات حق تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، کل قیامت کے دن تمام مؤمن حق تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھوں سے ہی دیکھیں گے، لیکن اِدراک نہیں کر سکیں گے ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ﴾ یعنی (نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکیں گی) وہ صرف دو چیزیں معلوم کر سکیں گے: ایک تو اس بات کا یقینی علم کہ وہ دیکھ رہے ہیں اور دوسرے وہ لذت جو رؤیت پر مرتب ہوتی ہے، ان دو چیزوں کے علاوہ باقی جس قدر رؤیت کے لوازم ہیں، وہ سب مفقود ہوں گے " ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ "۔

سلوک کی ابتداء:

جب کوئی طالب کسی شیخ اور پیر کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرنا چاہے تو شیخ کو چاہیے کہ سب سے پہلے اسے تین سے لے کر سات تک استخارہ کرنے کا حکم فرمائے، کیونکہ حق تعالیٰ کی مشیت کا جاننا ضروری ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دیکھا دیکھی بیعت ہو جاتے ہیں، یا کر لیتے ہیں، لیکن اس کا حصہ اور شیخ کے ہاتھ پر لکھا ہوتا ہے۔

استخارہ کی شرعی حیثیت:

استخارہ کا لغوی معنی '' طلبِ خیر'' ہے، یعنی کسی کام کی اچھائی یا برائی کے متعلق حق تعالیٰ سے مشورہ طلب کرنا استخارہ کہلاتا ہے۔

حدیث شریف میں اس کی بہت ترغیب آئی ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے
''ابن آدم کی سعادت اس میں ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے استخارہ (طلب خیر) کرتا رہے اوراس کی بدبختی یہ ہے کہ استخارہ ترک کردے۔ (مستدرک للحاکم)

سوال: اگر کوئی شخص بیعت کے لیے حاضر ہوتو اسے استخارہ کا مشورہ کیوں دیا جاتا ہے؟ حالانکہ بیعت بذات خود امرِ خیر ہے۔

جواب: اس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ حق تعالیٰ کی مشیت کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس کا حصہ کسی اور شیخ کے ہاتھ پر لکھا ہوتا ہے، اور وہ اپنا وقت برباد کرتا ہے، سالک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

☆ استخارہ کا مشورہ اس لیے بھی دیتے ہیں کہ طالب کو کسی قسم کا پچھتاوا نہ رہے اور بعد میں وہ کیف افسوس نہ ملتا رہے، تاکہ دورانِ استخارہ معاملہ بالکل واضح ہوجائے اوراسے اس بات کا یقین ہوجائے کہ میرا فیض اِنہیں شیخ کے پاس ہے۔

☆ بعض لوگ کبھی کسی شیخ سے کوئی وظیفہ پوچھتے ہیں کبھی کسی دوسرے شیخ سے ورد پوچھتے ہیں اس لیے مشائخ اپنا وقت اور ہمت اس قسم کے لوگوں پر ضائع نہیں کرتے بایں وجہ ان کوآزمانے کی خاطر استخارہ کا مشورہ دے دیتے ہیں، تاکہ اگر وہ متذبذب مرید ہوا تو آئے گا ہی نہیں۔

☆ بارہا یہ بات دیکھنے میں آئی کہ جب کسی کو شیخ نے کہا کہ کل آنا ہم تجھے داخلِ بیعت کرلیں گے تو وہ آتا ہی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یقین لے کرنہیں آیا تھا اس لیے بزرگانِ دین استخارہ کا مشورہ دیتے ہیں۔

ہمارے ایک ساتھی جب حضرت شیخ اسماعیل واڈی صاحب رحمہ اللہ کسی کو استخارہ کا حکم فرماتے تھے تو وہ حضرتؒ سے اِصرار کر کے بیعت کروا لیتے تھے اور بھی بہت سی باتیں حضرتؒ سے منوا لیتے تھے، ان صاحب کو یہ نہیں پتہ کہ شیخ کے آداب کیا ہے اور

ان کا اس طرح کا عمل شیخ کے منشاء کے خلاف ہے۔

طالبوں کی اقسام:

اسّی (۸۰) فیصد لوگ رسمی مرید ہوتے ہیں جن کے دلوں میں نہ حق تعالیٰ کی طلب ہوتی ہے اور نہ اپنی اصلاح کی فکر ہوتی ہے، وہ بیعت کے بعد نہ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، نہ محنتیں اور مجاہدے کرتے ہیں، اور نہ ہی عملی طور پر اس کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

ہماری گفتگو کا لُبِّ لُبَابُ یہ ہے کہ مریدین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) خرافاتی مرید (۲) رسمی مرید (۳) حقیقی مرید۔

اس فقیر کے تجزیہ کے مطابق اٹھارہ فیصد خرافاتی مرید ہوتے ہیں، اسّی فیصد رسمی مرید ہوتے ہیں اور بمشکل دو فیصد حقیقی مرید ہوتے ہیں۔

استخارہ کے بعد طالب میں کسی قسم کا تذبذب پیدا نہ ہو تو اس کے کام کو شروع کرے۔ سب سے پہلے اسے دو رکعت نماز توبہ پڑھنے کے لیے کہے، کیونکہ توبہ کیے بغیر اس راہ میں قدم رکھنا مفید نہیں پڑتا۔

توبہ:

توبہ کا لغوی معنیٰ ''رجوع کرنا'' ہے۔ شریعت مطہرہ میں مذموم کاموں سے لوٹ کر محمود کاموں کی طرف آجانے کا نام توبہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ریاض الصالحین میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر گناہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہو تو اس کے لیے توبہ کی تین شرطیں ہیں:

(۱) گناہ سے رک جائے (۲) گناہ پر شرمندہ ہو (۳) پھر اس گناہ کے اعادہ نہ کرنے

کا پختہ عزم کرے۔

اگر ان شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو توبہ صحیح نہیں ہوگی اور اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو پھر توبہ کی چار شرطیں ہیں: تین شرطیں تو وہی مذکورہ بالا ہیں اور چوتھی شرط یہ ہے کہ حقدار کو اس کا حق ادا کر دے۔ اگر کسی کا مال لیا تھا تو وہ اسے لوٹا دے، اور اگر کسی پر جھوٹی تہمت لگائی تھی تو اس سے حد نا فذ کرنے پر قادر کرے، یا اس سے معافی مانگ لے۔

جس طرح توبہ کی تین شرطیں ہیں، ایسے ہی ندامت کے تین اسباب ہیں:

(۱) جب عقوبت کا خوف دل پر چھا جاتا ہے اور افعالِ بد پر دل میں اندوہ وغم کا پیدا ہونا ہے۔

(۲) جب نعمت کی خواہش قلب پر مستولی ہو جائے اور اس بات کا علم ہو جائے کہ فعل بد اور نافرمانی کی وجہ سے اس نعمت سے محروم رہے گا تو اس پر پشیمان ہونا۔

(۳) روزِ قیامت حق تعالیٰ اور تمام مخلوق کے سامنے اپنی بے نقابی کے تصور سے خائف ہو کر بُرے افعال پر نادم ہونا۔

ان میں سے پہلے کو تائب دوسرے کو مُنِیب اور تیسرے کو اَوّاب کہتے ہیں۔ پس! توبہ کبیرہ گناہوں سے، اعمالِ صالحہ کو بجالاتے ہوئے حق تعالیٰ کے حضور میں رجوع کرنا ہے اور اِنابت صغیرہ گناہوں سے حق تعالیٰ کی محبت کے باعث رجوع کرنا ہے اور اوّبت اپنی ذات کو چھوڑ کر حق تعالیٰ طرف رجوع کرنا ہے۔

جبکہ حقیقتِ توبہ یہ ہے کہ بندہ ممنوعہ افعال کے ارتکاب سے محض حق تعالیٰ کے خوف کی بنا پر باز آ جائے حقیقت توبہ کہلاتا ہے۔

بعض لوگ شیخ کامل مکمل کے دستِ حق پرست پر بیعت ہونے کے باوجود فیض

سے محروم رہتے ہیں، اس کی چند وجوہات ہیں:

(۱) ان کی حقیقت توبہ تک رسائی نہیں ہوتی۔

(۲) ان کی طلب صادق نہیں ہوتی۔

(۳) وہ غافل مزاج ہوتے ہیں۔

(۴) حقیقت اخلاص سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔

(۵) کم کوش اور پست ہمت ہوتے ہیں۔

(۶) اپنے طریقت اور مشائخ عظام کے ساتھ والہانہ لگاؤ نہیں ہوتا۔

اگر کوئی مذکورہ بالا وجوہات، جہالت اور حماقت کی بنا پر شیخ کی خدمت میں بار بار توجہ اور فیض کے لیے عرض بھی کرتا رہے، اسے فیض نصیب نہیں ہوتا۔

اگر شیخ پست ہمت، بے شوق اور اور طلبِ صادق سے محروم مریدوں کو فیض عطا بھی فرما دے تو اس قسم کے مرید کا فیض چغلی، غیبت، حسد، بغض، لقمۂ حرام وغیرھا کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔

جان لے! کہ اگر کوئی شخص حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا نہیں کرتا، کوئی پیر فقیر خواہ زمانے کا غوث ہی کیوں نہ ہو اسے منازلِ سلوک طے نہیں کروا سکتا، اسے کبھی بھی روحانی ارتقا نصیب نہیں ہوسکتی، وہ جہالت اور مذلت کے گڑھوں میں پڑا رہے گا۔ اسے حق تعالیٰ اور حضور ﷺ کا قرب میسر نہیں ہوسکتا۔ بالفرض ایسا شخص اگر شیخ بھی بن جائے وہ سب دجل و فریب ہے اسے حقیقتِ مشیخیت نہیں ملی وہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قابلِ گرفت ہوگا، اس کی اپنی نجات مشکل ہے وہ دوسروں کی نجات کا ذریعہ کیسے بنے گا؟

توبہ کی نصیحت کے بعد شیخ اسے اس کی باطنی استعداد کے مطابق ذکر کی تعلیم

دینا چاہیے۔

باطنی تربیت کے مختلف طریق:

چونکہ راہِ سلوک طے کرنے کے متعدد طریقے ہیں اور لوگوں کی روحانی ہمتیں، ذوق اور باطنی استعدادیں بھی متفاوت ہیں، اس لیے ہر ایک کی استعداد کے مطابق ذکر تلقین کرنا چاہیے، کیونکہ کچھ لوگ بالکل ہی کور باطن ہوتے ہیں، کچھ لوگ متوسط درجہ کے ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ راہِ سلوک طے کرنے کے لیے نہایت مستعد اور بلند ہمت ہوتے ہیں، اس لیے سب کو ایک جیسا ذکر تعلیم و تلقین نہیں کرنا چاہیے، جیسی سالک کی باطنی لیاقت اور روحانی استعداد ہو اس کے مطابق اسے ذکر تجویز کرنا چاہیے۔

جان لے! ایسا وہی شیخ طریقت کر سکتا ہے جس نے خود سلوک طے کیا ہو عروجی منازل اور نزولی مراتب سے مکمل طور پر آگاہ ہو، راہ سلوک کی مشکل گھاٹیوں اور منزلوں سے پوری طرح واقف ہو، یہ شیخ ناقص کے بس کا روگ نہیں، شیخ کو چاہیے کہ طالب کو ذکر و شغل کے طریقوں میں سے وہ طریقہ سکھائے جو اس کے حال کے مناسب اور اس کی استعداد و قابلیت کے لائق ہو، لیکن یہ اس شیخ کے لیے ہے جو کمالِ ولایت سے تعلق رکھتا ہو، اس لیے کہ ولایت کا کمال جذبہ و سلوک کے ساتھ وابستہ ہے، اور یہ دونوں ولایت کے رکن ہیں، ولایت ان دونوں کے بغیر متحقق نہیں ہوتی۔ پس! کمالِ ولایت میں شیخ کے لیے ضروری ہے کہ مرید کے حال کا لحاظ رکھے اور اس کو اس کی استعداد کے مناسب طریقہ سکھائے اور جو طریقہ اس کی استعداد کے خلاف ہو وہ نہ سکھائے، اس کے لیے سلوک کو آسان کرے، تاکہ اس کے کام میں خلل نہ پڑے، مثلاً جب کسی کی استعداد جذبہ کے مناسب ہو تو اس کو وہ طریقہ سکھائے جو جذبہ کے

مناسب ہو اور اگر شیخ اس کو ایسا طریقہ سکھائے گا جو سلوک کے مناسب ہوگا تو اس کے کام میں خلل واقع ہوگا اور دیر لگے گی، یا سلوک میں دشواری پیش آئے گی اور شیخ و سالک دونوں کو اس امر کی اصلاح میں مشقت اٹھانی پڑے گی۔اور جو شیخ ولایت سے ترقی کر کے تعبیت و وراثت کے ذریعہ کمالاتِ نبوت تک پہنچے تو وہ جذبہ وسلوک کے دائرہ سے نکل کر، کیونکہ کمالاتِ نبوت ان دونوں جذبہ وسلوک سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں سے بالا ہیں، اور اس طریق میں سالک کی ترقی محض شیخ کی صحبت و محبت اور شریعتِ عالیہ وسنت نبویہ ﷺ کے اطوار کے اتباع کے ساتھ اس شیخ کے آداب کو ملحوظ رکھنے سے ہے اس وقت ذکر کی تعلیم کرنا طالب کی تسلی کے لیے ہے اور اگر چہ ذکر فی نفسہٖ مفید ہے، لیکن وصول کا مدار نہیں ہے۔

تعلیم طریقہ کے بعد شیخ کو چاہیے کہ طالب و مرید کو اپنی خصوصی توجہات سے نوازتا رہے اور حق تعالیٰ کے حضور اس کی روحانی ارتقاء کے لیے التجائیں کرتا رہے، تاکہ سالک جلد از جلد عروجی مدارج اور نزولی منازل طے کر سکے۔

شیخ، طالب و مرید کو راہِ طریقت کی نزاکتیں اور لطافتیں بیان کرتا رہے اور اسے بلند ہمتی کی تلقین اور آداب و شرائط طریقت کی تعلیم دیتا رہے، تاکہ سالک سے کوئی ایسی دانستہ یا غیر دانستہ غیر ذمہ دارانہ حرکت سرزد نہ ہو جائے، جو آدابِ طریقت کے منافی ہو، اسی لیے مشائخ طریقت کو مریدین کے لیے وعظ ونصیحت کی مجالس کا اہتمام کرنا چاہیے۔شیخ کامل راہِ طریقت کے آداب و شرائط مریدین کے سامنے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کتاب وسنت اور سلفِ صالحین کے آثار کی اتباع کی ترغیب دیتا رہے۔

مرید و طالب کا مطلوب و مقصود حق تعالیٰ ہے اور طالب و مطلوب کے درمیان شیخ وسیلہ ہے، جیسا کہ قرآن کی آیت کریمہ ﴿ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ﴾ یعنی (اور اللہ تعالیٰ

کی طرف وسیلہ ڈھونڈھو) سے عیاں ہے ۔

چونکہ شیخ کامل نبی علیہ السلام کا کامل وارث اور نائب ہے، لہٰذا شیخ کامل کے حقوق و آداب حق تعالٰی اور اس کے رسول ﷺ کے بعد سب سے زیادہ ہیں ۔ نیز طریقتِ نقشبندیہ میں فیض کا حصول صحبتِ شیخ اور تعلیم طریقہ پر منحصر ہے ۔ طالب و مرید کو اپنے آپ کو کلی طور پر شیخ کے حوالے کر دینا چاہیے اور اس کی پیروی اس طرح کرے جیسے مردہ بدست زندہ، اس لیے ہم نے اپنی کتاب " تَرْبِيَّة السَّالِكِين " میں آداب شیخ لکھ دیئے ہیں ۔

اس راہ کے طالب و مرید کو چاہیے کہ اوّل اپنے عقائد کو علمائے اہل حق کے عقائد کے موافق درست کرے ، جس طریقہ پر کہ علماء اہل حق نے کتاب وسنت کو سمجھا ہے اور اس سے اخذ کیا ہے ، کیونکہ ہمارا اور آپ کا سمجھنا ان بزرگواروں کی فہم اور رائے کے موافق نہیں ہے ، تو وہ حدود واعتبار سے ساقط ہے ، کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے باطل احکام کو کتاب وسنت کے مطابق سمجھتا ہے ۔ اہل سنت و جماعت کے خلاف خبث اعتقاد سمِ قاتل ہے ، جو ہمیشہ کے عذاب و عتاب تک پہنچا دیتی ہے ، عمل میں سستی اور کاہلی ہو تو مغفرت کی امید ہے ، لیکن اعتقاد کی خرابی اور کمزوری میں مغفرت کی گنجائش نہیں ہے ۔

جان لے ! اگر آج کوئی اس ناجی جماعت کی حقانیت کے متعلق متردد ہے تو کل قیامت کے روز حق و باطل میں امتیاز ہو جائے گا ، مگر اس وقت کا جاننا بے سود ہو گا اور سوائے افسوس ملنے کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا ، جیسا کہ قرآن میں ہے : ﴿ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيْلاً ۝ ﴾ (الفرقان) یعنی (اور یہ عنقریب معلوم کر لیں گے جب عذاب دیکھیں گے کہ سیدھے رستے سے کون بھٹکا ہوا ہے) ۔

جاننا چاہیے کہ مشائخ اہل سنت کے اختیار فرمودہ طریقہ کے مطابق سلوک طے کرنا چاہیے جو ہر قسم کی بدعات وخرافات سے پاک ہے اور غیر شرعی چلوں اور ریاضتوں سے اجتناب کرنا چاہیے، حالانکہ ان سے حق کے متعلق کسی قسم کا بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

جان لے کہ کچھ ایسے بھی ہے جو حق پرست لوگوں کو حق بات سے اور اہل سنت وجماعت کے عقائد کی تشہیر سے روکتے ہیں اور غیر شرعی باتوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور جو حق بات کہتے ہے تو ان کو بھی نرم گوشہ رکھنے کی نصیحت کرتے ہیں، تاکہ لوگ انہیں اچھا سمجھیں ان کا موقف یہ ہے کہ اگر ہم حق بات یا شرعی احکام بتائیں یا اس کی دعوت دیں تو لوگ مخالف ہو جائیں گے۔

پھر فقہ کے ضروری احکام کا علم حاصل کرے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے بعد اپنے تمام اوقات کو ذکرِ الٰہی میں مصروف رکھے، بشرطیکہ اس ذکر کو کسی شیخ کامل سے اخذ کیا ہو، کیونکہ ناقص سے کامل نہیں ہو سکتا اور اپنے اوقات کو ذکر کے ساتھ اس طرح معمور رکھے کہ فرضوں اور سنتوں کے علاوہ کسی چیز میں مشغول نہ ہو، حتیٰ کہ قرآن مجید کی تلاوت اور عباداتِ نافلہ کو بھی موقوف رکھے ذکر میں پختگی آنے تک، ہر حال میں ذکر کرتا رہے کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے اس کام میں مشغول رہے، نیز چلتے پھرتے اور سونے کے وقت بھی ذکر سے خالی نہ رہے۔

اس طرح دوامِ ذکر میں اس قدر مشغول رہے کہ مذکورہ کے سوا سب کچھ ترے سینے سے دور ہو جائے اور مذکور کے علاوہ ترے باطن میں کسی چیز کا نام ونشان تک نہ رہے، حتیٰ کہ بطور وسوسہ بھی ماسوا ترے قلب میں نہ گزرے اور اگر تکلف سے بھی غیر کا خطرہ دل میں لانا چاہے تو نہ لا سکے اور یہ نسیان جو قلب کو تمام ماسوائے مطلوب سے حاصل ہوا ہے وہ حصول مطلوب کا ایک مقدمہ ہے اور حصول مطلوب اور اس کے وصول کی خوشخبری دینے والا ہے اور نفس حصول مطلوب اور وصول حقیقی بمقصود کے

متعلق کیا لکھے کہ وہ وراء الوراء ہے۔

ہائے پہنچوں کس طرح محبوب تک		پر خطر ہیں کو ہ غار اس راہ میں

اور جب برادرِ عزیز، حق تعالٰی کی عنایت سے اس سبق کو انجام تک پہنچا لے تو دوسرے سبق کی طلب ظاہر کرے،" واللہ سبحانہ الموفق"۔

اور مریدین کو یہ بھی بتا دے کہ وہ کشف اور واقعات جو قرآن وحدیث سے بال برابر بھی مخالف ہوں اعتبار نہ کرے، بلکہ ان سے استغفار کرنا چاہیے۔راہِ سلوک کے دوران سالکین کو پیش آنے والے کشف اور واقعات جو شریعت مطہرہ اور سنتِ نبویہ ﷺ سے بال برابر بھی متصادم ہوں وہ درجۂ اعتبار سے ساقط اور نا قابل التفات ہیں، اس لیے اس قسم کے کشف و واقعات کی طرف متوجہ نہ ہو۔

کشف:

کشف کا لغوی معنی حجاب کا اٹھ جانا ہے۔اور اصطلاحِ طریقت میں ماورائے حجاب معانی غیبیہ اور امورِ حقیقیہ پر وجوداً اور شہوداً مطلع ہونا کشف کہلاتا ہے۔طالب کو کتاب وسنت کے مخالف مکشوفات و واقعات سے استغفار کرنا چاہیے۔

واقعہ:

صوفیائے کرام کی اصطلاح میں واقعہ اس امر کو کہا جاتا ہے جو سالک کے قلب میں واقع ہو خواہ بیداری کی حالت میں ہو یا نیند کے عالم میں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس وقت سالک کے حواس ظاہری معطل ہوں۔صوفیائے کرام واقعات کے مشاہدہ میں نیند کے محتاج نہیں ہوتے۔

شیخ کو چاہیے کہ مرید کو طہارت، غسل، وضو، نماز، روزہ وغیرہا کے بنیادی اور

ضروری احکام و مسائل کی تعلیم دے، یا مرید کو تاکید فرمائے کہ اس کو سیکھے۔

جاننا چاہیے کہ موجودہ دور میں ’’رہ گئے مجاور یا گورکن‘‘ کے مصداق خانقاہوں اور آستانوں پر عمل سے بے بہرہ پیری اور شیخی کی گدی نشین ہو کر براجمان ہیں ’’ إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ ‘‘ وہ اپنے مریدوں اور طالبوں کو کتاب و سنت، شریعت و طریقت اور فقہ وتصوف کی کیا تعلیم دیں گے۔ بقول اقبال مرحوم ؎

مراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد		زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کیونکہ اس راہ میں سالک کے عقائد و اعمال علمائے اہل سنت و جماعت کے عقائد و اعمال کے موافق درست ہونے چاہئیں، جو دو پروں کی حیثیت رکھتے ہیں، جب تک اعتقادی اور عملی دونوں پر میسر نہ ہو جائیں باطنی سیر اور روحانی پرواز نصیب نہیں ہوتی، اور مریدوں اور طالبوں کو تاکید کرے کہ حرام اور مشتبہ لقمہ میں احتیاط کی بہت رعایت رکھے۔ مشتبہ امور کے متعلق متعدد اقوال ہیں جو سالکین کے لیے لکھتے ہیں۔

سالک کے لیے کھانے میں احتیاط:

حرام حلال کی ضد ہے، رزقِ حلال کی طلب فرائض میں سے ہے تو اس کی ضد حرام سے احتراز کرنا بھی فرض اور لازم ہے۔ رشوت، سود خوری، ذخیرہ اندوزی، دھوکا دہی اور جھوٹ بول کر مال حاصل کرنا وغیرہا، جیسے ناجائز ذرائع سے مال حاصل کردہ سب ناجائز اور حرام ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جس کا کھانا پینا اور لباس حرام کمائی سے ہے اور اسے غذا بھی حرام کمائی سے دی گئی ہو اس کی دعا کیسے قبول ہو۔ (مسلم)

جو شخص حرام مال سے صدقہ و خیرات دیتا ہے وہ گویا ناپاک کپڑوں کو پیشاب

سے دھونے کی کوشش کرتا ہے، جو بجائے خود اور بھی زیادہ ناپاک ہوتا ہے۔

جس حلال سے حرام میں پڑنے کا اندیشہ ہو اس حلال کو بھی ترک کر دینا بہتر ہے، سالک کے لیے جس طرح حرام سے اجتناب کرنا لازم ہے، ایسے ہی سالک کے لیے مشتبہات سے احتراز کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ حق تعالیٰ کے عتاب سے محفوظ ہو جائے جیسا کہ قرآن میں فرمایا: ﴿ وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّناً وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴾ یعنی (اورتم خیال کرتے ہو کہ یہ معمولی بات ہے، حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی ہے)۔

حدیث شریف میں بھی مشتبہات سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''بلا شبہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ جو شخص ان مشتبہات سے بچا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں داخل ہو گیا''۔ (صحیح مسلم)

پہلا قول:

مشتبہ اُمور فی نفسہا مشتبہ نہیں ہیں، بلکہ ان کا مشتبہ ہونا اضافی ہے، یعنی جو شخص ان امور کا حکم نہیں جانتا اس کے لیے یہ مشتبہ ہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے ہر چیز بیان فرما کر اس کی دلیل قائم کر دی ہے، البتہ ایک بیان جلی ہے جسے ہر شخص جان لیتا ہے اور ایک بیان خفی ہے جسے صرف علماء ہی اجتہاد اور استنباط کے طریقوں سے جانتے ہیں۔

دوسرا قول:

امور مشتبہ سے مراد اُمور اجتہاد یہ ہیں یعنی جس شئی کا حلال و حرام ہونا کتاب

وسنت کی صریح عبارت سے معلوم نہ ہو اور نہ ہی اس پر اجماع ہو، جیسے موجودہ دور میں انسانی اعضاء کی پیوند کاری، جیسے جھینگا کھانا یہ اختلافی مسئلہ ہے۔امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دریائی جانوروں میں سے صرف مچھلی اپنی تمام قسموں کے ساتھ حلال ہے، اور چونکہ جھینگا مچھلی نہیں، اس لیے امامِ اعظمؒ کے نزدیک کھانا جائز نہیں ہوگا۔ بڑی تعجب کی بات ہے کہ ہمارے علماء بھی کھاتے ہے، حالانکہ حنفیہ کے نزدیک مکروہِ تحریمی ہے۔ یہ کوئی سنت یا مستحب نہیں ہے اور اس کے نہ کھانے پر کوئی گناہ نہیں، جب یہ مشتبہ ہے تو کیا کھانا ضروری ہے؟ ایسے امور اجتہاد یہ ہیں جن کا حکم مجتہد اپنے اجتہاد سے معلوم کرتا ہے اور اسے حلال یا حرام کے ساتھ لاحق کر دیتا ہے اگر مجتہد کسی چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال قرار دے دے، پھر بھی اسے تقویٰ کے تقاضہ کے مطابق اس کے ارتکاب سے باز رہنا چاہیے۔

تیسرا قول:

مشتبہ امور سے مراد امورِ مکروہہ ہیں، مذکورۃ الصدر حدیث سے مقصود امورِ مکروہہ سے اجتناب پر تاکید کرنا ہے، کیونکہ بہت سے لوگ امورِ مکروہہ سے اجتناب نہ کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ حرام تو نہیں ہے، جیسا کہ پہلے ہم نے جھینگا کے بارے میں ذکر کیا۔

چوتھا قول:

امورِ مشتبہ سے مراد اُمور مباحہ ہیں اور تقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ مباح امور سے بھی اجتناب کیا جائے، کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ خلفائے راشدین اور اکثر صحابہؓ مباحات سے بھی اجتناب کرتے تھے، ان نفوسِ قدسیہ نے اچھے مشروبات اور اچھے مکانات کو

قصداً حاصل نہیں فرمایا اور انہوں نے اپنے اجتہاد اور ارادے سے فقیرانہ زندگی کو اختیار فرمایا۔

پانچواں قول:

مشتبہ امور سے مراد وہ امور ہیں جن کی حلت وحرمت میں دلائل متعارض ہوں اوران امور میں احتیاط اورتقویٰ کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کوترک کر دیا جائے ، کیونکہ حضور ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ''جو چیز تمہیں شک میں مبتلا کر دے اسے چھوڑ دو'' ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے رستے میں پڑی ہوئی کھجور پا کر ارشادفرمایا: ''اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ کہیں یہ کھجورصدقہ کی نہ ہوتو میں اس کوکھالیتا'' (متفق علیہ)۔

سالک کوکھانے پینے کی اشیاء کے متعلق نہایت محتاط رہنا چاہیے مشتبہ طعام کو جب تک شریعت مطہرہ کے مطابق کھانے کی اجازت نہ ہو طالب کواس قسم کا طعام کھانے سے احتراز کرنا چاہیے، ورنہ روحانی مزاج اور باطنی احوال بگڑ جاتے ہیں۔

سالکین پر وارد ہونے والی دو حالتیں:

دورانِ سلوک سالکانِ راہِ حقیقت پر دوقسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں: یا تو وہ اہلِ کشف ومعرفت ہوتے ہیں، یا پھرارباب جہل وحیرت ہوتے ہیں۔

اہلِ کشف ومعرفت دورانِ سلوک ہرقسم کے مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ہر قسم کے مظاہرکو پہچانتے ہیں۔

جبکہ اربابِ جہل و حیرت دورانِ سلوک پیش آنے والے مظاہر اور مناظر کو

نہیں جانتے۔

جہل کا معنی معروف جہالت نہیں، بلکہ اہل طریقت کے نزدیک جہل کا مطلب یہ ہے کہ سالک دورانِ سلوک راہِ سلوک کے نشیب وفراز نہیں جانتا۔ اور حیرت کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال کی مسافت کواتنی جلدی طے کر لینے پراس پر جو حیرانگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے اسے حیرت کہا جاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ منازل طے کر لینے اور حجابات اٹھ جانے کے بعد دونوں گروہ واصل ہو جاتے ہیں۔نفس وصول میں دونوں برابر ہیں۔ایک گروہ کو دوسرے پر فضیلت نہیں، جیسے دو شخص دور دراز کی منزلیں طے کر لینے کے بعد کعبہ تک پہنچ جاتے ہیں، ایک تو راستے کی منازل کو دیکھتا گیا اور اپنی استعداد کے مطابق ہر ہر منزل کی تفصیل کو جانتا ہوا پہنچا۔اور دوسرا رستے کی منازل سے آنکھیں بند کر کے گیا، تو تفصیلات سے آگاہی نہ پائی۔

مقامِ حیرت:

یہ طریقت کا انتہائی مقام ہے، جس کا مطلب انکشافِ حقیقت پر حیران ہو جانا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبیؐ کریم ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے "اَللّٰھُمَّ زِدْنِيْ تَحَيُّرًا فِيْكَ" یعنی (اے اللہ! مجھے اپنی ذات میں حیرت کی فراوانی عطا فرما)۔

حیرت کی دوقسمیں ہیں:

حیرت مذموم: یہ حیرت جہالت کا نتیجہ ہوتی ہے اور تنزلی کا سبب بنتی ہے۔

حیرت محمود: یہ حیرت علم کا نتیجہ ہوتی ہے اور عروج وترقی کا سبب بنتی ہے۔

حیرت و جہل:

حیرت و جہل سے مراد اشیائے کائنات سے لاتعلقی و بے خبری ہے۔ جب کثرتِ ذکر اور فرطِ محبت کے غلبہ سے عارف اپنے محبوبِ حقیقی کے مشاہدہ میں ڈوب جاتا ہے اور محبوب کے سوا سب کچھ اس کی نظر سے پوشیدہ ہو جاتا ہے اور مرتبۂ احدیت میں محو ہو کر تجلی اسمِ "ھُوَ" کا مشاہدہ کرتے ہوئے انکشافِ حقیقت پر ہکّابکّا رہ جاتا ہے، تو اسی کو حیرت و جہل کہا جاتا ہے، لیکن یہ حیرت و جہل محمود ہے نہ کہ مذموم، اسی کو فنائے مطلق، مرتبۂ جمع اور اِدراکِ بسیط بھی کہتے ہیں، اور اسی مرتبہ کے اثرات و ثمرات ہیں کہ منصور حلاج حالاتِ سکر میں "أَنَا اللّٰہُ" کہہ بیٹھتے ہیں، اگر ان کے زمانہ میں اس وقت کوئی نقشبندیہ بزرگ ہوتا تو منصورؒ کو اس مقام سے روحانیت کے ساتھ پار کروا دیتا۔

جب اہلِ کشف و معرفت اور اربابِ جہل و حیرت کو حرمِ یار تک رسائی نصیب ہو جاتی ہے تو واصل باللہ ہو کر بھی وہ عالم تحیر میں مستغرق رہتے ہیں، جب وہ اس کی ذات میں غور کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور کیفیت کیا ہے وہ کس جہت اور سمت میں جلوہ گر ہے، اس سے سب جاہل اور عاجز ہیں، البتہ اتنا باطنی طور پر احساس ضرور ہوتا ہے کہ وہ مل گیا ہے، ہر آن ایک نئی جان محسوس ہوتی ہے، ہر لمحہ سہارا ملتا ہے، ہر گھڑی غیبی صدا آتی ہے مت گھبراؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں، وہ ہر آن تائید غیبی اپنے ساتھ پاتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس کی تجلیات میں گم رہتے ہیں، لیکن ذات کی کنہہ سے عاجز ہوتے ہیں، ذاتِ حق تعالیٰ کی معرفت ناممکن ہے، ذات میں معرفت حاصل نہ کر سکنے کو ہی معرفت کہا جاتا ہے، جس کا نتیجہ جہل اور عجز ہے۔ چنانچہ خلیفۂ رسول ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے: "اَلْعِجْزُ عَنْ دَرکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ"

یعنی (ادراک کے درک سے عجز ہی ادراک ہے) کیونکہ حق تعالیٰ کی ذات ادراک سے وراء ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا:﴿ لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارُ ﴾ یعنی (نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے) سے عیاں ہے۔

راہِ سلوک مقاماتِ عشرہ کے حصول پر موقوف ہے:

جاننا چاہیے کہ منازلِ سلوک کا طے کرنا دس (۱۰) مقامات کے حصول پر موقوف ہیں ،جنہیں مقاماتِ عشرہ کہا جاتا ہے، جو درج ذیل ہیں: توبہ،زہد،توکل،صبر،شکر، خوف، رجاء،فقر،قناعت،رضا۔

ہماری کتاب "تربِیَّۃُ السَّالِکِین" میں مقاماتِ عشرہ کے لکھنے میں غلطی ہوئی ہے، انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں اس کی اصلاح کی جائے گی۔

مقامِ رضا کے علاوہ بقیہ نو مقامات کے حصول تجلی افعال اور تجلی صفات کے ساتھ وابستہ ہیں، جبکہ مقامِ رضا کا حصول تجلی ذات اور محبت ذاتیہ کے ساتھ وابستہ ہے، جس میں ایلام وانعام دونوں برابر ہوتے ہیں۔

توبہ:

شریعت میں جو کچھ مذموم (بُرا کام) ہے اس سے لوٹ کر محمود (اچھا کام) کی طرف آجانے کا نام توبہ ہے۔

جان لے کہ توبہ وصول الی اللہ کے لیے پہلی شرط ہے۔سالک مقامِ توبہ میں سیر کرتا ہوا حق تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔

زُہد:

زہد ایک مرتبۂ قلبیہ ہے اس مرتبہ میں سالک کے قلب سے دنیا کی محبت نکل جاتی ہے اور وہ قلبی طور پر دنیا کی طرف التفات نہیں رکھتا، کیونکہ وہ قلبی طور پر طلبِ دنیا اور خواہشاتِ نفس سے فارغ ہو چکا ہوتا ہے۔

قناعت:

جو رزق کسی انسان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے اس پر راضی رہنے کا نام قناعت ہے۔
مفقود چیز کی امید کو ترک کرنے اور موجود چیز کے ساتھ استغناء کا نام قناعت ہے۔

توکُّل:

توکل ایک مرتبۂ قلبیہ ہے جس میں متوکل بندہ اپنے امور حق تعالیٰ سپرد کر دیتا ہے اور تمام احوال میں اسی پر اعتماد کرتا ہے اور اپنی کوشش اور محنت کے بعد نتیجہ مُسَبِّبُ الاسباب پر چھوڑ دیتا ہے۔

توکل علی اللہ سے دلوں میں سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے، خاص کر مصائب اور مشکلات کے وقت توکل علی اللہ بندہ کے لیے آخری سہارا ثابت ہوتا ہے۔

صبر:

ابتلاء کے وقت لوگوں کے ساتھ حق تعالیٰ کا شکوہ نہ کرنے کا نام صبر ہے۔ صبر کی بہت سے اقسام ہیں، ان اقسام کا خلاصہ تین اقسام پر مشتمل ہے:

(۱) عبادات پر صبر (۲) مصائب پر صبر (۳) گناہوں سے صبر۔

غرض! یہ کہ صبر انبیاء کی صفت ہے، اولیاء کی زینت ہے، فقراء کی خلعت ہے۔

شکر:

حق تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو اسی مقصد کے لیے صَرف کرنا جس کے لیے وہ نعمتیں پیدا کی گئی ہیں، شکر کہلاتا ہے۔

شکر کے اجمالی طور پر تین اقسام ہیں:

(۱) زبان سے شکر ادا کرنا (۲) اعمال کے ذریعہ شکر کرنا (۳) دل سے شکر کرنا کہ یہ نعمت اللہ کی طرف سے ہے۔

خوف:

بندہ کو کبھی حق تعالیٰ کی صفات کی معرفت خوف کے درجہ پر پہنچا دیتی ہے۔ دل کے لیے مناسب یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے خوف کے سوا کوئی اور چیز اس پر غالب نہ ہو۔

رجاء:

حق تعالیٰ کے جلال کو جمال کی آنکھوں سے دیکھنے کا نام رجاء ہے۔

فقر:

حدیث شریف میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے‘‘۔ (ترمذی)

فقیر نہ اپنا محتاج ہوتا ہے نہ غیر کا۔

رضا:

قرآن مجید میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ﴾ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا کو تمام نعمتوں سے بڑی قرار دیا ہے۔ حقیقی رضا کا مقام یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندہ سے راضی ہو جائے اور بندہ حق تعالیٰ سے راضی ہو جائے، تا کہ دونوں رضائیں متلازم اور مترابط ہو جائیں۔ ان مقامات میں سے پہلا مقام توبہ ہے اور سب سے آخری اور افضل مقام رضا ہے۔

دیگر مقامات کا حصول آخرت میں نہیں ہوگا، کیونکہ ان کا تعلق عالمِ شہادت کے ساتھ ہے، عالم آخرت کے ساتھ نہیں، البتہ مقامِ شکر جو کہ مقامِ رضا کا ایک شعبہ ہے وہ اہل جنت کو ضرور حاصل ہوگا، تا کہ مزید انعامات و اکرامات وعنایات سے مالا مال ہو سکیں۔

ایک سوال ہوتا ہے کہ بعض اوقات شیخ کامل مکمل جس نے مقامات عشرہ کی تحصیل اور راہِ سلوک کی تکمیل کر لی ہوتی ہے ان سے بھی مقامات کے برخلاف عاداتِ قبیحہ اور افعالِ ناپسندیدہ کا اظہار ہو جاتا ہے، مثلاً توکّل کے منافی کئی چیزیں دیکھی جاتی ہیں اور بے طاقتی جو صبر کے منافی ہے ظاہر ہوتی ہے، اور کراہت جو رضا کی ضد ہے پائی جاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان مقامات کا تعلق قالب اور جسم انسانی کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ قلب و روح کے ساتھ مخصوص ہے، اخص خواص کی نسبت یہ مقامات نفس مُطْمَئِنَّہ میں بھی حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن قالب اس معنی سے خالی اور بے نصیب ہے۔

کسی شخص نے شیخ شبلیؒ سے پوچھا کہ آپ محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ فربہی (موٹاپن) تو محبت کے منافی ہے، شیخ شبلیؒ نے اس کے جواب میں یہ شعر پڑھا کہ ''میرے قلب نے محبت کی، لیکن میرا بدن بے خبر رہا، اگر اسے خبر ہوتی تو فربہ نہ ہوتا''

صوفیائے کاملین میں نقائص باقی رکھنے کی حکمتیں:

جاننا چاہیے کہ عامۃ الناس اور ناقصین میں ان مقاماتِ عشرہ کے برعکس نقائص وعیوب ان کی کلیت ومجموعی حیثیت اور ظاہر وباطن میں سرایت کئے ہوتے ہیں، جبکہ صوفیائے کاملین کے باطن ان نقائص سے پاک ہوجاتے ہیں، یہی چیزیں ہیں کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اپنے اولیاء کے حجاب بنایا ہے۔ اکثر لوگوں کو ان بزرگواروں کے کمالات سے محروم رکھا۔ ان چیزوں کے اولیاء میں باقی رکھنے میں دو حکمتیں ہیں: اور پہلی یہ کہ حق کا باطل سے عدمِ امتیاز ہے جو اس دارِ دنیا کے لوازم سے ہے، جو آزمائش کا محل ہے، عوام کے لیے۔

اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اولیاء میں ان چیزوں کے باقی رکھنے کی اگرچہ صورت کے لحاظ سے ہوان کی ترقی ہے۔ کسی فعلِ قبیح کا ظہور ہوجاتا ہے تو یہ حضرات اس پر سخت نادم و پشیمان ہوتے ہیں، حق تعالیٰ کے حضور توبہ اور آہ وگریہ زاری کرتے ہیں، یوں ان اہل اللہ کے لیے نوید مغفرت اور بلندی درجات کا سامان ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ چیزیں اولیاء سے بالکل مرفوع ہوجائیں تو ترقی کا راستہ مسدود ہوجائے اور فرشتوں کی مانند محبوس ہوجائیں۔

مثلاً جب حق تعالیٰ سبحانہ کی قدرت کو اپنے اوپر اور تمام اشیاء پر مشاہدہ کرتا ہے تو بے اختیار توبہ اور اِنابت کی طرف رجوع کرتا ہے اور خوف کھاتا ہے اور لرزتا ہے اور ورع کو اپنا شیوہ بنالیتا ہے اور اس کی تقدیر پر صبر کرتا ہے اور بے طاقتی سے رہائی حاصل کرلیتا ہے، اور جب نعمتوں کا مالک اسی کو سمجھتا ہے اور عطا کرنا اور روک لینا اسی حق تعالیٰ سبحانہٗ سے جانتا ہے، لامحالہ مقامِ شکر میں آتا ہے اور توکل میں راسخ

قدم ہو جاتا ہے اور جب نرمی اور مہربانی جلوہ گر ہوتی ہے تو مقام رجاء میں آتا ہے اور جب اس کی عظمت اور کبریائی کا مشاہدہ کرتا ہے اور کمینی دنیا اس کی نظر میں ذلیل اور بے اعتبار دکھائی دیتی ہے، تو لامحالہ دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے اور فقر اختیار کرلیتا ہے اور زہد کو اپنا شعار بنا لیتا ہے، لیکن جاننا چاہیے کہ ان مقامات کا حصول تفصیل اور ترتیب کے ساتھ سالک مجذوب کے ساتھ مخصوص ہے اور مجذوب سالک ان مقامات کو اجمالی طور پر طے کرتا ہے، کیونکہ اس کو عنایت ازلی نے ایسی محبت میں گرفتار کیا ہے کہ ان مقامات کی تفصیل میں پڑنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ اس محبت کے ضمن میں ان مقامات کا لبِ لباب اور ان منازل کا خلاصہ مکمل طور پر اسے حاصل ہے جو صاحبِ تفصیل کو بھی میسر نہیں ہوتا۔ سلامتی ہو اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

تجلی آفاقی و انفسی:

سالک جب سیرِ انفسی کے دوران ولایتِ صغریٰ (ولایتِ ظلیہ) کے مقام کے ساتھ ممتاز ہوتا ہے تو وہ جو تجلی بھی دیکھتا ہے۔ نیز معرفت یا حیرت بھی اپنی ذات میں ہی ملاحظہ کرتا ہے اور اس تجلی میں اس کی حیرت کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالمِ وجوب کی بے کیف تجلی ہوتی ہے جو سالک کے عدمِ اِدراک کی وجہ سے سببِ حیرت بن جاتی ہے، اس کو تجلیٔ انفسی کہتے ہیں۔ اس مقام میں سالک کوشش کرتا ہے کہ تجلی آفاقی جو تجلی انفسی کا ظل ہے منقطع ہو جائے، کیونکہ جب تک تجلی آفاقی منقطع نہ ہو جائے فنائے کامل حاصل نہیں ہوتی اور جب فنا ناقص ہوگی تو بقا بھی ناقص ہوگی، اس لیے بقا بقدر فنا ہوا کرتی ہے اور فنائے مطلق و مطلق فنا میں فرق یہ ہے کہ فنائے مطلق، فنائے تام ہے اور مطلق

فنا، فنائے ناقص ہے۔فنائے مطلق میں سالک کو ماسوا کا نسیان تام ہو جاتا ہے۔اور اس کا لطیفہ اپنے مبداء فیض تک پہنچ جاتا ہے، جبکہ مطلق فنا میں ایسا نہیں ہوتا۔

مرتبۂ وجوب:

یہ مرتبہ صفاتِ کلیہ کا جامع مرتبہ ہے اور دائرۂ اصل سے تعلق رکھتا ہے، یہ سالک کے لیے مشاہدہ کا مقام ہے اور وہ اس رتبہ میں صفاتِ حقیقتِ ثمانیہ کی سیر کرتا ہے۔

"أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" کی حکمت:

ایمان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) عوام کا ایمان ہے کہ حق تعالیٰ کو بغیر دیکھے دل و جان سے گرویدہ ہو کر ایمان لائے ہیں۔

(۲) ایمان اولیاء اللہ کا ہے کہ وہ صاحبان مشاہدہ ہیں ان کا ایمان شہودی ہوتا ہے، کیونکہ ظلمانی حجاب کو یہ حضرات چاک کر چکے ہوتے ہیں جو بے صبری، بے قناعتی، بے توکلی اور خیال غیر سے عبارت اور نورانی حجاب کو طے کر کے مرتبۂ شہود تک پہنچے ہوتے ہیں، جو صفات وشیونات اور اعتباراتِ ذاتیہ سے عبارت ہے۔

(۳) ایمان خاص الخاص اکابر کا ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار شہود سے بھی آگے گزر گئے ہوتے ہیں اور کمالِ وصال سے پیوستہ ہوتے ہیں اور ان کا ایمان بھی ایمان غیبی کے رنگ میں ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ کی کمالِ اتصال کے مرتبہ میں گنجائش نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص اپنا ہاتھ پشت کے پیچھے لے جائے تو غیب ہے اور جب اپنے سامنے لے آئے تو مشاہدہ ہو جائے گا، اور آنکھ کی پتلی پر رکھ

لے تو پھر غیب ہو جائے گا۔ پس! وصل بے فصل کے مرتبہ میں بھی غیب محقق ہے، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جو خاص الخاص حضرات ہیں وہ عوام کی مانند ہوتے ہیں " أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ " میں یہی راز پوشیدہ ہے۔

اہل اللہ کے صفائے باطن کی بنا پر ہر وقت حق تعالیٰ کی جمالی اور جلالی تجلیات کا ورود ہوتا رہتا ہے۔جس عارف پر تجلیاتِ جمالیہ کا غلبہ ہو وہ حق تعالیٰ کے جمال کا مظہر ہوتا ہے، اس لیے اُس سے زیادہ محبت و پیار کا ظہور ہوتا ہے، اور جس سالک اور صوفی پر حق تعالیٰ کی تجلیاتِ جلالیہ کا غلبہ ہو وہ حق تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہوتا ہے، اس لیے اس سے غضب اور جلال کا ظہور ہوتا ہے اور بعض عارف حق تعالیٰ کے جلال و جمال دونوں کے مظہر ہوتے ہیں جب کبھی تجلیاتِ جلالیہ کا غلبہ ہو جائے تو ان سے جلال کا ظہور ہوتا ہے اور جب کبھی تجلیاتِ جمالیہ کا غلبہ ہو جائے ان سے جمال و پیار کا ظہور ہوتا ہے۔

جب کوئی سالک خلوصِ نیت اور صدق قلب کے ساتھ کسی شیخ کامل مکمل کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کرتا ہے اور حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو شیخ کے حوالہ کر دیتا ہے اور مردہ بدست غسال کے مصداق ہر قسم کی مشقت و ریاضت اور شیخ کی جلالی و جمالی تربیت کو بطیّب خاطر برداشت کرتا ہے اور توحید مطلب کا متوالہ بن کر شاہراہ محبت پر گامزن جہاد اکبر میں مصروف ہو جاتا ہے تو ایسا سالک کندن بن کر روحانی ترقی پر گامزن رہتا ہے اور اپنے مقصود کو پالیتا ہے، چونکہ شیخ کامل کا ہر کام حق تعالیٰ کی رضامندی پر موقوف ہوتا ہے، اس لیے اگر وہ کسی سالک کو سخت وسست، ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن کرتا ہے تو اس میں " المريد لا يريد إلا الله " کی اصلاح و تربیت مقصود ہوتا ہے، ذاتی اغراض اور نفسانی فساد و انتقام کا اس میں کوئی

دخل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی کم فہم، ظاہر بین اور نادان شخص شیخ کی ایسی حرکات وسکنات کو دیکھ یاسن کر چیں بجبیں ہو جائے اور جلال، جلال کی رٹ لگا تا رہے تو اس کا کیا علاج؟

قہر وعتاب میں بھی تو رحمت ہے مستتر		یہ نکتہ کب خیال میں ناقص کے آسکے

قلب ہی تجلیاتِ الٰہیہ کی گنجائش رکھتا ہے:

مخلوق کی خالق کے ساتھ سوائے خالقیت اور مخلوقیت کے کوئی مناسبت نہیں، لیکن اگر کائنات میں سب سے زیادہ کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ مناسبت ہے تو وہ قلب ہے۔

چونکہ قلب عجیب وغریب لطیفہ ہے، اس لیے اس میں حق تعالیٰ کی ان عجیب قدرتوں کا ظہور ہوتا ہے جو مخلوق میں سے کسی چیز میں بھی ظاہر نہیں ہوتا، اس لطیفہ میں اس قدر وسعت ہے جتنی اٹھارہ ہزار عالم کی کائنات میں بھی نہیں، یہاں تک کہ قلب میں حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کا ظہور ہوتا ہے اس کے شیونات واعتبارات کا ظہور ہوتا ہے، تجلی ذات کا ظہور ہوتا ہے، اسی لیے حدیث قدسی ہے کہ ''زمین وآسمان میری گنجائش نہیں رکھتے جتنی گنجائش میرے بندۂ مومن کا قلب رکھتا ہے'' یعنی میرے جلووں کے تحمل اور برداشت کرنے کی طاقت وصلاحیت میرے بندہ کا دل ہی رکھتا ہے۔

بقول شاعر......

دو جہاں کی وسعتیں کہاں تجھ کو پاسکیں		ایک میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے

صفائے قلب شیخ کی توجہات پر موقوف ہے:

عالمِ ارواح میں سب نوری شکلوں میں رہتے تھے، وہ نور جو اس جہاں میں ہمارے لیے قلب کا کام کرتا تھا حق تعالیٰ نے عالمِ ارواح کے اس نور کا تعلق جسمِ انسانی میں

مضغۂ گوشت کے ساتھ قائم کر دیا ہے،اسی محلِ نور کا نام لطیفۂ قلب ہے، شیطانی تصرفات اور نفسِ مجاورت کی وجہ سے قلب نوری پر بھی کثافتیں چھا جاتی ہیں، اب ایسا شخص ہونا چاہیے جو نفی اثبات کے پانی اور توجہات کے صابن سے دھوبی کی مانند ان آلائشوں اور کثافتوں کو دھوئے جو قلبِ نوری کو صاف شفاف، " مصفّٰی مزکّٰی " کر کے اس کا تعلق دوبارہ عالمِ بالا کے ساتھ قائم کر دے، اسی تصفیہ وتزکیہ کرنے والی شخصیت کو شیخ کامل کہا جاتا ہے، جب شیخ کامل کسی سالک کے قلب کا تصفیہ کر دیتا ہے تو اہل دل کہتے ہیں کہ اس کا لطیفۂ قلب روشن ہو گیا ہے، اس کے لیے دو چیزیں شرط ہیں: ایک مرید وسالک و طالب کی محنت اور اس سے بھی بڑھ کر محض حق تعالیٰ کا فضل ہے، اگر حق تعالیٰ کا فضل کسی طالب کے شاملِ حال ہو جائے تو اس کے عالمِ باطن کے لطائف اور جواہر چمک جاتے ہیں، اس چمک اور روشنی سے آگے عجیب معاملہ ہے جو بیان وزبان اور تحریر وتقریر سے باہر ہے۔

حصولِ فیض کے لیے اہل اللہ کی نیازمندی لازم ہے:

ظاہر بین شخص کے لیے اہل اللہ کی دید باعث ہلاکت ہے اور دیدۂ بینا کے لیے ان کی زیارت باعث نجات ہے، اسی لیے عامۃ المسلمین کے یلے بالعموم اور سالکین طریقت کے لیے بالخصوص یہ تلقین وتاکید ہے کہ اہل اللہ کا ہمیشہ نیازمند ہی رہنا چاہیے اور خستہ دلی کے ساتھ ان کے حضور حاضر ہونا چاہیے، کیونکہ شکستہ دلی ہی قابل توجہ اور لائق التفات ہوتی ہے۔

یہ وہ حضرات ہیں کہ ان کا باطن رحمت ہے اور ان کا ظاہر زحمت ۔بصورت جَو دکھانے والے ہیں بحقیقت گندم عطا فرمانے والے۔بظاہر عوام بشر ہیں اور باطن میں خاص فرشتوں سے۔ان کا ہم مجلس شقاوت سے بچا ہوا اور ان کا مونس سعادت سے

ہمکنار ہے ۔ یہی لوگ حزب اللہ ہیں خبر دار! یقیناً حزب اللہ ہی فلاح پانے والا ہے ۔
دراصل حق تعالیٰ نے اہل اللہ کے صفائے باطن کی وجہ سے ان کے باطن کو ان کے لطائف عالمِ امر کی طہارت و لطافت اور بے مثل و بے کیف کے ساتھ رنگین ہونے کی بنا پر صورتِ بشریت اور اپنی قبائے قدرت میں پوشیدہ رکھا ہے ، جیسا کہ " أوليائي تحت قبائي لا يعرفهم سوائي " سے عیاں ہیں ، تا کہ ان کی صورتِ بشریت ان کے باطنی وحقیقی کمالات کی پردہ پوش ہو جائے ۔ نیز ہر کس و ناکس ان کے باطنی کمالات سے آگاہ نہ ہو اور یہ پردہ پوشی اس قدر زائد ہوتی ہے کہ ان اہل اللہ کے ظاہر کو بھی ان کے باطن کی اطلاع نہیں ہوتی ، جب اولیاء کے باطن پر ان کے ظاہر کو بھی آگاہی نصیب نہیں ہوتی تو عامۃ الناس کیسے مطلع ہو سکتے ہیں؟

جذب وسلوک :

جذب کا معنی ہیں کشش ، یعنی حق تعالیٰ کا بندہ کو اپنی طرف کھینچ لینا ۔

مجذوب وہ ہے جس پر حق تعالیٰ کی طرف سے ایسا جذبہ طاری ہو جائے کہ بلا کسب ومجاہدہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے اس کے باطنی مقامات طے ہو جائیں اور واصل باللہ ہو جائے ، لیکن بَقا بعدَ الفَناء اور جَمعُ الجَمع کے مرتبہ تک نہ پہنچ سکے ۔

سلوک کا معنی ہیں '' راستہ '' یعنی حق تعالیٰ کے قُرب اور وصل کے راستہ پر چلنا ۔

سالک وہ ہے جو قربِ حق کے راستوں اور طریقت کی منزلوں کو مجاہدات وریاضات اور اتباعِ سنت وشریعت کے ذریعہ طے کر کے مقصود تک پہنچے ۔ قرآن کی اس آیت ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ إِلَيْهِ مَنْ يَّشآءُ وَيَهْدِيْ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ٥ ﴾ میں " اِجتَباء " سے مُراد جذبہ ہے اور " اِهتداء " سے مراد سلوک ہے ۔ نیز سلوک پر جذبہ کی تقدیم بھی ثابت ہوئی ۔ مشائخِ نقشبندیہ جذبہ کو سلوک پر مقدم رکھتے ہیں اور مجذوب سالک کہلاتے ہیں ۔

اقسامِ سالک:

سالک کی دوقسمیں ہیں: سالکِ مجذوب اور مجذوب سالک۔
سالکِ مجذوب وہ ہے جس کوسلوک کی انتہاء میں جذبہ نصیب ہو۔
مجذوب سالک وہ ہے جس کےسلوک کی ابتدا جذبہ سے ہو۔
نقشبندی مشائخ مجذوبِ سالک ہوتے ہیں ان کا سلوک جذبہ سے شروع ہوتا ہے۔

اقسامِ جذبہ:

جذبہ کی دوقسمیں ہیں: جذبہ صوری اور جذبہ حقیقی۔

جذبہ صُوری: وہ جذبہ جوسیر فی اللہ سے قبل ابتدائے سلوک میں تصفیۂ لطائف سے پہلے حاصل ہوتا ہے اورصرف تسہیلِ منازلِ سلوک کے لیے عطا کیا جا تا ہے، اس کو جذبۂ صوری کہتے ہیں اس کو جذبۂ بدایت یا جذبۂ اُولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔

جذبۂ حقیقی: وہ جدبہ جوسیر فی اللہ کے دورانِ انتہائے سلوک میں حاصل ہوتا ہے،اس کو جذبۂ حقیقی کہتے ہیں،اس کو جذبۂ نہایت یا جذبۂ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔

جذبۂ حقیقی بلا امتیاز تمام سلاسلِ طریقت میں موجود ہے، لیکن جذبۂ صوری طریقۂ نقشبندیہ کا خاصہ ہے اور یہ نعمت حضرت خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبند بخاریؒ کے توسل وفیضان سے ابتداء میں ہی حاصل ہو جاتا ہے۔

فنا:

سالک کو ماسوی اللہ کا نسیان فنا کہلاتا ہے،یعنی ذاتِ حق تعالیٰ کی ہستی کا سالک کے ظاہر و باطن پر ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کا اپنا وجود اضافی معتبر نہ رہے اورصرف

وجودِ حقیقی متحضر رہ جائے۔

بقاء:

مرتبۂ فنا میں جن اشیاء آفاق وانفس کا نسیان ہو گیا تھا سالک کو پھر دوسروں کی تکمیل و ہدایت کے لیے انہیں اشیاء کی طرف واپس لوٹا دینا ''بقا'' کہلاتا ہے، یعنی کامل فنا کے بعد سالک کو جو کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کو بقاء کہتے۔

جاننا چاہیے کہ مرتبۂ بقا میں اشیاء کے ساتھ سالک کا علمی تعلق فنا سے قبل کے تعلق سے کمیت، کیفیت اور غایت کے اعتبار سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔اس مرتبہ میں مخلوق کی طرف سالک کی توجہ قطعاً غیر اختیاری ہوتی ہے اور اس معاملہ میں حق تعالیٰ کی رضا غالب ہوتی ہے، نہ کہ سالک کی ذاتی رغبت، کیونکہ سالک تو اس مرتبہ میں مقامِ اطمینان پر فائز المرام ہوتا ہے۔

سالک کے عروجی مراتب اور نزولی مدارج:

سالک جب عروجی مرتبوں میں ہوتا ہے تو اس کے تعلقات دنیا اور محبت دنیا کے جذبات ماند پڑنا شروع ہو جاتے ہیں،لامحالہ ما سویٰ اللہ کی معلومات کم ہونا شروع ہوجاتی ہیں، یہ ولایت کا درجہ ہے جس میں ہر سالک کے لیے ایک خاص مقام ہوتا ہے، کسی کو فنا کم ہوتی ہے، کسی کو زیادہ ہوتی ہے اور کسی کو بہت زیادہ فنا سے حصہ نصیب ہوتا ہے،مگر جب سالک عروج کے بعد نزول کرتا ہے تو دنیوی تعلقات پھر بحال ہونا شروع ہو جاتے ہیں،نتیجۃً اشیائے کائنات کے زائل شدہ علوم دوبارہ عود کر آتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جب تک آدمی اشیائے کائنات کے علم و دانش اور دنیوی تعلقات

کی طرف راغب ہے، دنیا کی محبت میں گرفتار ہے اور ماسویٰ اللہ کے نقوش اس کے قلب ونظر میں پیوست ہیں، وہ ناقابل اعتبار، بے لحاظ اور ذلیل ہے۔

نسیانِ ماسوا راہِ طریقت کی شرط ہے۔نسیانِ ماسوا کا مطلب ہے حق تعالیٰ کے ماسوا کو بھول جانا، اسی کو فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ماسویٰ کی دوقسمیں ہیں: (۱) آفاق (۲) انفس۔

آفاق کے نسیان سے مراد آفاق کی نسبت علمِ حصولی کا زوال ہے اور انفس کے نسیان سے مراد انفس کی نسبت علمِ حضوری کا زوال ہے، کیونکہ علمِ حصولی کا تعلق آفاق سے ہے اور علمِ حضوری کا تعلق انفس سے ہے، اگر چہ اشیاء کے علمِ حصولی کا مطلقاً زوال دشوار ہے، کیونکہ وہ اولیاء کا حصہ ہے اور علمِ حضوری کا مطلقاً زوال تو بہت ہی زیادہ دشوار ہے، کیونکہ یہ کاملین اولیاء میں سے اکمل اولیاء کو حاصل ہے۔بہت ممکن ہے کہ اس کا جائز ہونا، بلکہ تصور بھی اکثر عقلاء کے نزدیک محال ہو اور ''معلوم'' کا جاننے والے کے لیے عدم حضور، باطل سمجھیں، کیونکہ ان کے نزدیک حضورِ شئی، نفسِ شئی کے لیے ضروری ہے، لہٰذا علمِ حضوری کا زوال ان کے نزدیک اگر چہ ایک لمحہ کے لیے ہی ہو، جائز نہیں ہے چہ جائیکہ اس علم کا مطلقاً اس طرح زوال ہو جائے کہ پھر کبھی عود نہ کر سکے، یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟

علمِ حصولی کا نسیان فنائے قلب پر موقوف ہے اور علمِ حضوری کا نسیان فنائے نفس کو مستلزم ہے جو اتم و اکمل ہے، اور حقیقتِ فنا اسی مقام میں ہے خصوصاً فنائے قلب اس فنا کے لیے ظاہری صورت کی مانند ہے جو اس کا ظل ہے، کیونکہ علمِ حصولی درحقیقت علمِ حضوری کا ظل ہے، لہٰذا لازماً اس ظل کی فنا، اس کی فنا ہوگی اور اس فنا کے حصول کے

ساتھ نفس مقامِ اطمینان میں آ جاتا ہے اور حق تعالیٰ سے راضی و مرضی ہو جاتا ہے اور بقا ورجوع کے بعد تکمیل و ارشاد کا معاملہ اس سے متعلق ہوتا ہے اور اسے عناصرِ اَربعہ خاک ،ھوا، پانی ، نار کی مختلف طبیعتوں کے ساتھ جہاد وغزا میسر ہو جاتا ہے۔

قلب سے ما سوا کے نسیان کی علامت قلب میں ما سوا کے خطرات کا نہ آنا ہے ، اس طرح کہ اگر بہ تکلف ان خطرات ما سوا کو یاد دلا یا جائے تو بھی یاد نہ آئیں ، بلکہ قلب ان کو قبول نہ کرے اور نفس عالم کے متعلق علم حضوری کے زوال کی علامت یہ ہے کہ عالم اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے بالکل " منتفی " ہو جائے تا کہ علم اور معلوم کا زوال اس سے متصور ہو، کیونکہ اس مقام میں علم اور معلوم ،نفس عالم ہے اور جب تک نفسِ عالم زرال پذیر نہ ہو جائے علم ومعلوم کی نفی نہیں ہوتی اور فنائے اول فنائے آفاق ہے اور فنائے ثانی فنائے انفس ہے جو فنا کی حقیقت ہے۔

سالک کو خلافت مقید دینے کا سبب:

بعض اوقات شیخ کامل مکمل اپنے کسی صاحب استعداد ،ذکر وفکر میں مصروف ومشغول مرید کو لوگو سے بیعت لینے کی اجازت مرحمت فرما دیتے ہیں ،تا کہ دوسروں کی تعلیم وتربیت کے دوران اس ناقص کی بھی تکمیل ہو جائے ۔اس قسم کے من وجہٍ ناقص اور من وجہٍ کامل مرید کو خلیفہ مقید کہا جاتا ہے، جبکہ تکمیل سلوک کے بعد صوفیائے کاملین اسے خلافت مطلقہ عطا فرما دیتے ہیں، لیکن آج کل دیکھا یہی جا تا ہے کہ اس طرح سے کسی کو خلافت مقید دے دی جاتی ہےتو وہ اپنے آپ کو بھول کر لوگوں کی فکر میں لگ جاتا ہے۔

یہاں خلیفہ مقید کے لیے شرائط و قیود کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے، تا کہ سالکین

طریقت کو تنبیہ و آگاہی حاصل ہو جائے۔

اگر کوئی طالب و مرید آپ کے پاس ارادت کے ساتھ آئے اور مشغول رہنے کا ارادہ ظاہر کرے تو اسے شیر کی مانند سمجھنا چاہیے اور اسے طریقہ سکھانے میں بہت تامل کرنا چاہیے اور ڈرتے رہنا چاہیے مبادا اس امر میں پیر کے لیے استدراج مطلوب اور خرابی منظور ہو۔ اگر بالفرض کسی مرید کا آنا خوشی و سرور کا باعث ہو تو اس کو کفر و شرک کی مانند برا سمجھنا چاہیے اور اس کا تدارک استغفار و ندامت کے ذریعہ اس حد تک کرنا چاہیے کہ فرحت و سرور کا اثر بالکل زائل ہو جائے، بلکہ خوشی کی بجائے غم و خوف قلب پر مستولی ہو جائے اور اس بارے میں التجاء و تضرّع کا طریق اختیار کر کے چند مرتبہ استخارہ کرنا چاہیے، تاکہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ اس کو طریقہ سکھانا چاہیے یا نہیں؟ اور اس میں کسی قسم کی کوئی خرابی و استدراج مراد نہیں ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کے بندوں میں تصرف کرنا اور اپنے وقت کو ان کے پیچھے ضائع کرنا حق تعالیٰ کے اِذن واجازت کے بغیر جائز نہیں۔ قرآن میں فرمایا ﴿ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ﴾ اس معنی پر دال ہے، تاکہ کل روز قیامت ہر قسم کی جوابدہی اور باز پرس سے محفوظ رہ سکیں۔ مرید کے مال میں طمع اور دنیوی منافع کی توقع ہرگز نہیں رکھنا چاہیے۔

ہم نے سنا ہے کہ کچھ گدی نشین پیر اپنے مریدوں سے پیسہ لوٹتے ہے اگر کوئی مرید پیسہ نہ دے تو اس کا نام اپنے مرید کی فہرست سے نکال دیتے ہے ایسے لوگوں کے لیے بڑی خرابی ہے کل قیامت کے دن، اور کیونکہ ایسا کام مرید کی ہدایت میں رکاوٹ اور پیر کی خرابی کا باعث ہے، کیونکہ کہ حق تعالیٰ کے ہاں خالص دین کا مطالبہ ہے ﴿ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِص ﴾ (خبردار! دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے) شرک کو اس بارگاہ میں کسی طرح گنجائش نہیں اور جان لیں کہ ہر قسم کی ظلمت اور کدورت جو دل پر طاری

ہو جائے وہ توبہ واستغفار اور ندامت والتجا سے اچھی طرح دور ہوسکتی ہے، مگر وہ ظلمت وکدورت جو دنیا کمینی کی محبت سے دل پر چھا جائے اور اس کو بدمزہ اور خراب کر دے اس کا دور کرنا نہایت مشکل اور کمال دشوار ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا ہے کہ " حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ " یعنی (دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے)۔

حق تعالیٰ ہم اور آپ کو دنیا اور دنیا داروں کی محبت اور ان کی صحبت وہم نشینی سے بچائے، کیونکہ یہ زہر قاتل اور مرض مہلک اور بری بلا اور عام بیماری ہے۔

تلقین وارشاد کی مسند کے لیے صاحبِ تزکیہ ہونا ضروری ہے۔

خلیفہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) خلیفۂ مقید (۲) اور خلیفۂ مطلق۔

خلیفۂ مقید: وہ خلیفہ ہوتا ہے جس کے بعض لطائف فنا پذیر ہوں، لیکن ابھی کامل طور پر تزکیہ نفس نہ ہوا ہو، ایسے سالک کے لیے ضروری ہے کہ عمل ارشاد جاری رکھے، لیکن وساوس کے پیش نظر کثرت استغفار سے کام لیتا رہے اور اپنے شیخ کامل حیات ہو تو ان سے رہنمائی حاصل کرتا رہے اور اگر اپنا شیخ و پیر دنیا میں حیات نہ ہو تو کسی اور شیخ و پیر سے رہنمائی حاصل کرے اور اپنا معاملہ رضا تک پہنچائے۔

خلیفۂ مطلق: وہ خلیفہ ہوتا ہے جو تزکیہ نفس اور لطائف کی فنا کے بعد نفسانی اور شیطانی تسلط سے محفوظ ہو جائے لازماً اس کے اعمال مرضی حق تعالیٰ میں گم ہو جاتے ہیں اور اس کا عمل وعظ وارشاد بھی رضا میں داخل ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ خلیفۂ مطلق ہی اپنے شیخ مکرم کا وارث، اور اس کے جملہ تبرکات کا مستحق، اور جانشین ہوتا ہے، اور مرید کو اپنے نام کا شجرہ دے سکتا ہے، جبکہ خلیفۂ مقید بطریق سفارت اور بر سبیل نیابت لوگوں سے اپنے ہاتھ پر بیعت لیتا ہے اور اپنے شیخ

کا مرید بناتا ہے اور اپنے شیخ و پیر کے نام کا ہی شجرہ دیتا ہے، اسے اپنے نام کا شجرہ دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔

روح قالب انسانی میں:

حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمت سے بدن انسانی میں روح کو مقید کر دیا کہ روح کو جسمِ انسانی کا عاشق بنا دیا اور جسمِ انسانی کو روح کا معشوق بنا کر باہمی اتصال و مجاورت کے ذریعہ روح کی جلا اور چمک میں اضافہ کر دیا، جب حکمتِ الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ روحِ انسانی کو اپنے قرب و ارتقاء کی منزلوں پر فائض کیا جائے تو اس ذاتِ حق تعالیٰ نے جسموں سے پہلے روحوں کو تخلیق فرما کر ان کو عالمِ امر (لا مکان) میں قیام بخشا اور روح کی توجہات کو مرتبۂ وجوب کی جانب مبذول کر دیا، لیکن چونکہ روحوں کو ذات کے مزید قرب و وصال کی تمنا تھی اور کمالِ قرب و وصال کو حق تعالیٰ نے مجاہدہ اور ریاضت پر موقوف کر رکھا تھا اور عالمِ قدس (عالم امر) مجاہدہ کی مشقتوں اور کلفتوں سے پاک تھا بنا بریں حق تعالیٰ نے روح کو عالمِ امر کی نورانیتوں سے نکال کر عالمِ خلق میں انسانی بدنوں کی ظلمتوں میں داخل کر کے نفس کی مخالفت پر مامور کر دیا۔ روح نے اپنے معشوق ظلمانی میں فنائیت اور استغراق کی وجہ سے اپنی لا مکانیت و نورانیت کو فراموش کر دیا اور بے کیف کا رنگ اس سے پوشیدہ ہو گیا۔

انبیاء و اولیاء وطن اصلی کے نمائندے:

اگر روح انسانی پنجرے کے استغراق میں باقی رہ کر فنائیت مطلقہ تک نہ پہنچی تو اس کے لیے یقیناً ہلاکت اور بربادی ہے، کیونکہ وہ اپنے وطنِ اصلی سے دور رہ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے جوہر کو ضائع کر رہی ہے اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے حق تعالیٰ

نے دنیا میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام کو اپنی طرف دعوت دینے کا فریضہ سونپا اور لوگوں کو ان کے وطن اصلی کی یاد دلانے کا حکم دیا۔

چنانچہ اہل سعادت کی روحیں انبیاء و اولیاء کی دعوت پر اپنے وطن اصلی کی طرف عروج کر جاتی ہیں اور صالحین و مقربین کا مقام حاصل کر لیتی ہیں اور اہل شقاوت کی روحیں دعوت سے اعراض و انکار کر کے اپنے معشوق ظلمانی جسم کی قید میں رہ کر فاسق وفاجر و کافر کا خطاب پاتی ہیں۔

روح کا عروج:

جب حق تعالیٰ کے فضل سے شیخ کامل کی توجہات اور لطائف میں ذکر کی بدولت روح بیدار ہو کر عالمِ قدس کی طرف پرواز کرتی ہے تو نفس کو بھی اپنے ساتھ عروج کراتی ہے اور سیرِ عروجی کے ذریعہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اور اس میں لطافت اور نورانیت آجاتی ہے۔ چنانچہ نفس مُزَکّی و مطہر ہو کر نزول کرتا ہے اور روح مزید کمالات قرب حاصل کرنے کے لیے عروج کرتی رہتی ہے، یوں یہ دونوں روح و نفس اپنے اپنے مقامات اصلیہ و کمالات عُلْیا پر پہنچ کر روحی و نفسی عروج و نزول سے مشرف ہو کر فنا و بقائے روحی و نفسی سے شاد کام ہو جاتے ہیں۔ اور روح کے جسد میں نزول سے جو مقصود تھا وہ پورا ہو جاتا ہے، "والحمد للّٰہ علی ذلك"۔

جب روح عروجی منازل اور روحانی مدارج طے کرتی ہوئی دوبارہ عالمِ ارواح میں پہنچ جاتی ہے تو اس کی انتہاء، ابتداء کی طرف لوٹ جاتی ہے اور نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے بدن عنصری میں لطافت آجاتی ہے۔

پیری مریدی سے مقصود:

پیری ،مریدی سے مقصود شجرے ، قبّے ، عبائیں ، دستاریں ، نیازیں ،تعویذ دھاگے وغیرہا نہیں ، بلکہ لوگوں کے دل بہلانے کے لیے یہ سب کھلونے ہیں اور نہ ہی پیری مریدی کا مقصد عوام کالانعام سے نذرانے بٹورنا اور روپیہ پیسہ ہتھیانا ہے ، اور نہ ہی تصوف کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کمانا ہے ، بلکہ یہ سب دنیادار پیروں کے طلسمات اور شعبدے ہیں جن کا تصوف وطریقت وحقیقت اور شریعت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ۔ یہ جہالت کی پیداوار اور شیطانی افکار ہیں اس قسم کے سب کام حرام ہیں جن کے تصور سے بھی شرک کی بو آتی ہے ۔ بقول اقبال ؂

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نو امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

درحقیقت شجرے ، قبے ،تعویذ دھاگے اور مراقبہ میں اشعار پڑھ پڑھ کر رولانا وغیرھا اس ڈگڈگی کی مانند ہیں ، جس کو بجا کر مداری شعبدے دکھاتا ہے مقصود اس سے بالا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح بدن کی تاریکی اور گناہوں کی آلودگی سے روحانی توجہات اور ذکر وفکر و مراقبات ،سنت وشریعت پر پابندی وغیرھا کے ذریعے پاک ومطہر کر کے دوبارہ اس کا تعلق عالمِ ارواح سے کر دیا جائے ، دنیا کی محبت میں اور گناہوں میں لتھڑی ہوئی انسانیت کا پھر سے حق تعالیٰ کے ساتھ رابطہ استوار کر دیا جائے ، اس لیے سلاسل طریقت کے مقرر کردہ سلوک نقشبندیہ ، قادریہ ، چشتیہ ،سہروردیہ ان سلاسل میں داخل ہوکر شیخ کی رہبری میں طے کروایا جاتا ہے ، عالمِ امر اور عالمِ خلق کے لطائف میں توجہات دی جاتی ہیں ، مگر ہائے افسوس ! طریقت کے راہ نوردوں کو بیعت کر کے بغیر کسی منازل سلوک طے کروائے خلافت دیتے ہے اور ایسی تک محدود کر دیا گیا ان کو حقیقت سے آگاہی نہ بخشی گئی ’’ اٹھا میں مسجد و خانقاہ سے نمناک‘‘ کے

مصداق خانقاہیں اور مساجد و مدارس کسی صاحب نظر صوفی اور کسی صاحبِ توجہ درویش کی منتظر ہیں ۔ بقول اقبال مرحوم ؎

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب ونظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری !

شیخ کامل مکمل :

حقیقت یہ ہے کہ شیخ کامل مکمل وہ ہے کہ جس کی باطنی توجہ سے مرید کے قلب میں انقلاب پیدا ہو جائے اور وہ مرید کے قلب کو ذاکر بنا دے ، بلکہ خالص نقشبندی فقیر اور پیر وہ ہے جو مرید کے قلب سے نفسانی خواہشات و وسواس کو ہٹا کر اس کے دل پر اسم اللہ نقش کر دے اور اسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دے اور حق تعالیٰ کے ساتھ دائمی حضور کے مرتبے تک پہنچا دے جو شیخ یہ کام کرے مرید کے لیے وہی اپنے زمانہ کا امام ہے ، بقول اقبال ؎

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

اور مرید وہ ہے جو شیخ سے حق تعالیٰ کے قرب کے سوا کسی چیز کا مطالبہ نہ کرے ۔

روح کی عالمِ امر تک رسائی :

جب روح کی عالمِ ارواح تک رسائی ہو جاتی ہے تو قلب کے عالمِ ارواح سے تعلق کی وجہ سے وہ مقامِ برزخیت پر براجمان ہو جاتا ہے۔ روح کے عالمِ امر (عالم ارواح) تک رسائی کے دوران نفس بھی سکون پاتا جاتا ہے اور عالمِ امر کے رنگ سے رنگا جانے کی وجہ سے مطمئنہ ہونے کی بناپر وہ قلب اور بدن کے درمیان برزخ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

جب عالمِ امر کے لطائف قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ کی رسائی عالمِ ار واح تک ہو جاتی ہے اور نفس بھی ان کی اتباع میں لطیف اور مطمئنہ ہو جاتا ہے تو لطائف کے عالمِ قدس کی طرف پرواز کر جانے کے بعد قفس عنصری خالی رہ جاتا ہے تو سالک ہر قسم کی کدورتوں اور نفسانی شرارتوں سے پاک اور محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ حق تعالیٰ کے حضور یوں گویا ہوتا ہے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی		اب تو آجا اب خلوت ہوگئی

لطائف اور عناصرِ اَربعہ:

لطائف پر وارد ہونے والے انوار و تجلیات بدن عنصری خاک، آگ، ہوا، پانی پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں نتیجۃً جسم حق تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں مصروف ہو جاتا ہے۔

عالمِ امر کے لطائف کے تصفیہ، نفس کے تزکیہ اور عالمِ خلق کے عناصرِ اَربعہ پر انوار کے غلبہ کے باوجود، ان چاروں عناصر کی بغاوت، ثقالت، کثافت اور رذالت، جو دب گئی تھی کبھی کبھی وہ پھر اُبھرتی اور جوش مارتی ہے، دراصل یہ ان جواہر و عناصر کی فطرت میں شامل و داخل ہے جو صوفی و سالک کو گناہ پر اور احکامِ الٰہیہ کی مخالفت پر آمادہ کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے سالک سے کوئی نہ کوئی خطا و قصور واقع ہو جاتا ہے۔

معرفت:

معرفت کے معنی پہچاننے اور ایمان گرویدہ ہونے کو کہتے ہیں، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شناخت (معرفت) تو ہوتی ہے، مگر ایمان نہیں ہوتا، جس طرح کہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ کو حضور اکرم ﷺ کی معرفت و شناخت تو تھی جیسے کہ قرآن میں فرمایا گیا﴿ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾سے واضح ہے، مگر شقاوت، عداوت، بغاوت کی وجہ سے ایمان سے محروم رہے۔

معرفت کے اقسام:

معرفت کی دو قسمیں ہیں: (۱) صورتِ معرفت (۲) حقیقتِ معرفت۔

صورتِ معرفت: یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ کی جہالت کے باوجود لطیفۂ قلب کے ساتھ محدود ہوتی ہے۔

حقیقتِ معرفت: یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ اپنی جِبلّی جہالت سے باہر نکل آئے اور شناسائی پیدا کر لے۔ حق تعالیٰ نے محض اپنے کمالِ فضل سے صورتِ معرفت کو نفسِ ایمان میں اعتبار کیا ہے اور نجات کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ چنانچہ صورتِ ایمان کو بھی معتبر سمجھا ہے، لہٰذا صورتِ ایمان میں صورتِ معرفت کافی ہے اور حقیقتِ ایمان میں حقیقتِ معرفت کے بغیر چارہ نہیں۔

صورت عوام کا حصہ ہے اور حقیقت خواص کے ساتھ مخصوص ہے۔

حق معرفت:

معرفت کا حق یہی ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کو ان تمام کمالاتِ تنزیہات اور تقدیسات کے ساتھ پہنچانا جائے جن کو شریعتِ مطہرہ نے بیان کیا ہے، کیونکہ اس سے ماوراء کسی چیز کی معرفت باقی نہیں رہتی جو حق معرفت کو مانع ہو۔ دراصل وہی حقیقتِ معرفت ہے جو کہ معرفت سے عجز پر وابستہ ہے، جیسا کہ " بِاَنَّهٗ لَا یُعْرَف "(وہ پہنچانا نہیں جاتا)

سے واضح ہے، کیونکہ معرفت سے عاجز ہونا ہی معرفت ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد گرامی ہے: کہ ''معرفت کے ادراک سے عاجز ہونا ہی اس کی معرفت کا ادراک ہے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت سے عجز کے سوا اپنی مخلوق کے لیے کوئی رستہ نہیں بنایا''۔

جب حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ جو امت کے رئیس اور سردار ہیں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں تو دوسرا کون ہے جو معرفت کا دم بھرے۔

مقصد تخلیق:

حق تعالیٰ نے جنّات اور انسان کی تخلیق اپنی عبادت کے لیے فرمائی ہے اور عبادت کا مقصود معرفت ہے قرآن میں فرمایا گیا: ﴿ وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ﴾ یعنی (ہم نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا) '' لِیَعْبُدُوْنَ '' سے مراد معرفت ہے سے عیاں ہے، جس سے وجوبِ معرفت مفہوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کی معرفت کے واجب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ شریعتِ مطہرہ میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا پہچاننا واجب ہے اور ہر وہ معرفت جو شریعت کے بغیر حاصل کی جائے اُس کو اس فقیر کے نزدیک معرفت خدا کہنا جسارت ہے اور حق تعالیٰ پر ظن وتخمین کا حکم کرنا ہے ﴿ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی (کیا تم اللہ تعالیٰ کے لیے وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے)۔

اسلام کی دو قسمیں ہیں:

صورتِ اسلام: صورت اسلام علمائے ظواہر کا اسلام ہے، جنہوں نے مصداقات قضایائے شرعیہ کو کشفی نظر سے دیکھا تو نہیں، مگر دل سے تسلیم ضرور کرتے ہیں۔

حقیقتِ اسلام : حقیقتِ اسلام صوفیائے محققین اور عرفائے کاملین کا اسلام ہے ، جنہوں نے مصداقات قضایائے شرعیہ کو کشفی نظر سے مشاہدہ بھی کیا ہے اور زبان وقلب سے بھی تسلیم وتصدیق کے مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں ، ان کا ایمان استدلالی ، ایمان شہودی سے تبدیل ہو چوکا ہے اور ان کے علوم اجمالی ان کے حق میں تفصیلی ہو چکے ہیں ۔

جاننا چاہیے کہ وہ علماء جو تصوف وطریقت سے عدم دلچسپی کی بنا پر فنا اور بقا کے مراتب ومنازل سے بہرہ ور نہیں ان کے پاس صرف صورتِ اسلام ہے ، جو اضافی اور رسمی اسلام ہے ۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی		برق طبعی نہ رہی ، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں ، روح بلالی نہ رہی		فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی

کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا علامہ ، محدث ، مفسر کیو نہ ہو جب تک وہ کسی عارف کامل اور شیخِ طریقت کی زیرِنگرانی فنا اور بقا کی منازل طے نہیں کر لیتا ، وہ حقیقتِ اخلاص ، حقیقتِ اسلام اور حقیقتِ ایمان سے محروم رہتا ہے ، اس کے پاس صورتِ اخلاص ، صورتِ اسلام اور صورتِ ایمان ہی ہوتا ہے ۔

باطنی علم کی فضیلت :

کسی چیز کے متعلق جاننے والے کو عالم اور وہ چیز جس کے متعلق جانا گیا ، اسے معلوم کہتے ہیں ۔

علم کی شرافت معلوم کے شرف اور مرتبہ کے موافق ہے ۔ معلوم جتنا شریف تر ہو اس کا علم اتنا ہی عالی تر ہوگا ۔ پس! علمِ باطن جس سے صوفیہ ممتاز ہیں اشرف علمِ ظاہر سے

-

پتہ چلا کہ علم کی شرافت وفضیلت، معلوم کے مقام ومرتبہ کے اندازہ کے مطابق ہوتی ہے۔ پس! آداب پیر کی رعایت علم باطن کو جس سے اخذ کرتے ہیں کئی گنا زیادہ ہے آداب استاذ کی رعایت سے، علم ظاہر جس سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسی طرح علم ظاہر کے استاذ کے آداب کی رعایت کئی گنا زیادہ ہے اسکولوں، یونیورسٹیوں کے استاذ کے آداب کی رعایت سے، یہی تفاوت علوم ظاہری کی اضاف میں جاری ہے۔

جاننا چاہیے کہ شیخ و پیر کے حقوق تمام اہل حقوق کے حقوق سے بالا ہیں، بلکہ کوئی نسبت نہیں رکھتے شیخ و پیر کے حقوق دوسروں کے حقوق کے ساتھ، حق سبحانہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کے رسول ﷺ کے احسانات کے بعد، بلکہ تمام کے شیخ و پیر حقیقی رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ظاہری ولادت اگرچہ والدین سے ہے، لیکن معنوی ولادت شیخ وپیر کے ساتھ مخصوص ہے۔ ظاہری ولادت کی حیات چند روزہ ہے اور معنوی ولادت کی حیات اَبدی ہے۔ مرید کی معنوی نجاستوں کو شیخ و پیر اپنے قلب وروح سے صاف کرتا ہے اور اس کے باطنی حصوں کی تطہیر فرماتا ہے۔ ان توجہات میں جو بعض مریدوں کی نسبت واقع ہوتی ہے، محسوس ہوتا ہے کہ ان کی باطنی نجاستوں کی تطہیر کے دوران آلودگی صاحب توجہ پر بھی پڑ جاتی ہے اور ایک عرصہ تک مکدر رکھتی ہے۔ شیخ ہے کہ جس کے توسل سے حق سبحانہ تعالیٰ تک پہنچتے ہیں، جو تمام دنیوی اور اُخروی سعادتوں کا ضامن ہے۔ شیخ ہی ہے جس کے وسیلہ سے نفسِ اَمّارَہ جو بالذات خبیث ہے تزکیہ شدہ اور پاک ہو جاتا ہے اور امارگی سے اطمینان تک پہنچتا ہے اور جبلی کفر سے اسلام حقیقی تک آجاتا ہے۔

اگر ہم اس کی شرح کرے تو بے حد ہو جائے، پس اپنی سعادت کو شیخ و پیر کی

قبولیت میں جاننا چاہیے اور اپنی بدبختی کو اس کے رَدّ کرنے میں، ہم اس سے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔حق سبحانہ تعالیٰ کی رضا کو رضائے شیخ و پیر کے پسِ پردہ رکھا گیا ہے، جب تک مرید خود کو شیخ کی رضا مندیوں میں گم نہ کردے حق تعالیٰ کی مرضیات تک نہیں پہنچ سکتا۔مُرید کی آفت شیخ کی آزار تکلیف دینے میں ہے، ہر لغزش جو اس کے سوا ہو اس کا تدارک ممکن ہے، لیکن شیخ کے آزار اور تکلیف دینے کا کوئی چیز تدارک نہیں کرسکتی، شیخ و پیر کی ناراضگی مُرید کے لیے شقاوت کی بنیاد ہے، اس سے حق تعالیٰ کی پناہ اسلامی اعتقادات میں خلل اور احکامِ شرعیہ کی بجا آوری میں فتور اس آزار شیخ کے نتائج وثمرات میں سے ہے۔احوال ومواجید جو باطن کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں کے متعلق کیا کہیں اور احوال کا کوئی اثر اگر آزار شیخ کے باوجود باقی ہو، اسے استدراج شمار کرنا چاہیے، جو بالآخر خرابی کھینچ لائے گا اور ضرر کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دیگا۔اور سلامتی ہواس پر جو ہدایت کی اتباع کرے۔

علم کی دوقسمیں ہیں: (۱)علمِ ظاہر (۲)علمِ باطن

حدیث میں روایت ہے: " العلم علمان : فَعِلْمٌ في القلبِ فذلك العلمُ النافعُ وعلمٌ علَى اللسان ، فذلك حجة الله عز وجل على ابن آدم " یعنی (علم دو ہیں: ایک علم قلب میں ہے، یہ علم نفع بخش ہے۔دوسرا علم وہ ہے جو زبان پر ہوتا ہے، یہ اللہ عزوجل کی طرف سے ابن آدم پر حجت ہے)۔(مشکوۃ:۳۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:"میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن محفوظ کئے ہیں، ان میں سے علم کا ایک برتن میں نے تم میں بکھیر دیا ہے، مگر دوسرا برتن اگر تمہارے سامنے بکھیروں (ظاہر کروں) تو میرے گلے کی گذرگاہِ طعام کاٹ دی جائے۔(مشکوۃ:۳۷)

حدیث شریف میں علماء کی دوقسمیں بیان فرمائی گئی ہیں: علمائے سُوْ اور علمائے حق، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ میں ہے: ''خبردار! بُروں میں سب سے بُرے بھی علماء ہیں اور اچھوں میں سب سے بہتر بھی علماء ہیں''۔

علماء کے لیے دنیا کی محبت اور اس میں رغبت ان کے جمال کے چہرے پر دھبہ ہے۔مخلوق کو اگرچہ ان سے فائدے حاصل ہوتے ہیں، لیکن ان کا علم اُن کی اپنی ذات کے حق میں نافع نہیں ہوتا۔

یہ علماء پارس پتھر کی طرح ہیں کہ تانبا اور لوہا جو اس کے ساتھ لگ جائے سونا ہو جاتا ہے، اور وہ اپنی ذات میں پتھر کا پتھر ہی رہتا ہے، بلکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ علم ان کے اپنے نفس کے حق میں مضر ہے کہ حجت کو ان پر پورا کردیا، جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ''تحقیق لوگوں میں سے زیادہ عذاب کا مستحق قیامت کے دن وہ عالم ہے جس کو اپنے علم سے کچھ نفع حاصل نہ ہوا'' اور کیونکر مضر نہ ہو، وہ علم جو حق تعالیٰ کے نزدیک عزیز اور موجودات میں سے اشرف ہے اس کو دنیائے کمینی مال و جاہ کے حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے، حالانکہ دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک ذلیل وخوار اور مخلوقات میں سے بدتر ہے۔پس! حق تعالیٰ کے عزیز کو خوار کرنا اور اس کے ذلیل کو عزت دینا بہت بُرا ہے۔ حقیقت میں حق تعالیٰ کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔تعلیم دینا اور وعظ اور بیان کرنا اس وقت فائدہ مند ہے، جبکہ خالص اللہ ہی کے لیے ہو اور جب جاہ مال کی آمیزش سے خالی ہو اور اس خالی ہونے کی علامت یہ ہے دنیا میں زاہد ہو اور دنیا ما فیہا سے بے رغبت ہو، وہ علماء جو اس بلا میں مبتلا ہیں، اور اس کمینی دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں، وہ دنیا کے عالموں میں سے ہیں اور بُرے عالم ہیں، حالانکہ یہ لوگ اپنے آپ کو دین کا پیشوا جانتے ہیں اور مخلوقات میں سے اپنے آپ کو بہتر خیال کرتے ہیں، ظاہری طور پر ان کے ساتھ دینِ اسلام کی رونق اور تقویت وابستہ نظر آتی ہے، لیکن درحقیقت وہ علمائے دنیا ہوتے

ہیں، کیونکہ انہوں نے اس علم کو کمینی دُنیا، یعنی مال وجاہ کے حاصل کرنے کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ ہاں! وہ علماء جو دنیا سے بے رغبت ہیں اور مال وجاہ کی محبت سے آزاد ہیں، علمائے آخرت سے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور مخلوقات میں سے بہتر یہی علماء ہیں کہ کل قیامت کے روز ان کی سیاہی فی سبیل اللہ شہیدوں کے خون کے ساتھ تولی جائے گی اور ان کی سیاہی کا پلا بھاری ہو جائے گا۔

وہ لوگ ہیں جن کی نظروں میں آخرت کا جمال پسند آیا اور دنیا کی قباحت اور برائی معلوم ہوئی۔ آخرت کو بقا کی نظر سے دیکھا اور دنیا کو زوال کے داغ سے داغدار معلوم کیا۔ اس واسطے اپنے آپ کو باقی کے سپرد کیا اور فانی سے اپنے آپ کو ہٹا لیا۔ آخرت کی بزرگی مشاہدہ کرنے کے لوازم سے ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں سطن ہیں، یعنی دو عورتیں ایک مرد کے نکاح میں رہتی ہیں۔ ایک راضی گئی تو دوسری ناراض ہو گئی اگر دنیا عزیز ہے تو آخرت خوار، اور اگر دنیا خوار ہے تو آخرت عزیز، ان دونوں کا جمع ہونا گویا دو ضدوں کا جمع ہونا ہے۔

غرباء کون لوگ ہیں:

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اسلام غریب بن کر آیا اور غریب بن کر لوٹے گا، لہٰذا غرباء کے لیے خوشخبری ہے۔ پوچھا گیا، غرباء کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے فساد کی اصلاح کرتے ہیں''۔

اور ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ یہ لوگ میری ان سنتوں کی اصلاح کرتے ہیں کہ لوگوں نے جن میں خرابی پیدا کر رکھی ہے اور میری ان سنتوں کو زندہ کرتے ہیں جنہیں لوگوں نے ختم کر رکھا ہے، یعنی آپ ﷺ کے اس راستہ کو ظاہر کرتے ہیں جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے، اور ان سے بے خبر ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ لوگ میری سنت کو اور اس چیز کو جس پر تم آج قائم ہو، تھامنے والے ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ غرباء بہت زیادہ بُرے لوگوں میں تھوڑے سے نیک لوگ ہیں، ان سے محبت کرنے والوں سے زیادہ بغض رکھنے والے زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قبولیت کسی شے یا سبب پر منحصر نہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ حق تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کر لیتا ہے اور حق تعالیٰ صاحبِ فضل عظیم ہے۔

وتر کی نماز:

وتر کی نماز کا ادا کرنے کا جو وقت ہے وہ سنت کے مطابق حضور ﷺ نے کبھی رات کے پہلے حصے میں، کبھی آخری حصہ میں ادا کی ہے، تہجد کی نماز کے بعد پڑھنا سنت ہے، اس بارے میں کتبِ حدیث بھری پڑی ہیں۔ اس فقیر کو سوائے متابعتِ نبوی ﷺ کے اور کچھ مقصود نہیں، یہ فقیر کسی فضیلت کو متابعتِ نبوی ﷺ کے برابر نہیں سمجھتا۔ جناب سرور کائنات ﷺ وتر کی نماز کبھی رات کے پہلے حصہ میں ادا کرتے تھے اور کبھی آخری حصہ میں ہم اپنی سعادت اس بات میں جانتے ہیں کہ کسی کام میں حضورِ اکرم ﷺ سے تشبیہ حاصل کرے، اگر چہ تشبیہ بحسبِ صورت ہی ہو اہل علم حضرات بھی وتر کو عشاء کے بعد ہی پڑھ لیتے ہے، مجھے ان کی کوتہ اندیشی پر تعجب آتا ہے، خود جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی وتروں کو آخر میں پڑھنے کے بارے میں اور آپ ﷺ کا عمل مبارک بھی وتروں کو آخر میں پڑھنے کا تھا۔ ہماری فقہِ حنفی کی کسی مستند کتب میں چاہے، نور الایضاح اور قدوری سے لے کر ہدایہ اور فتح القدیر تک اور خلاصۃ الفتاویٰ سے عالمگیر اور شامی تک، بحرالرائق، نصب الرایہ، بزازیہ، قاضی خان، وغیرہ تمام مستند اور معتمد کتب میں وتروں کو آخر میں پڑھنے کو بہتر اور افضل فرمایا ہے۔ وتروں کے بعد نفل کو ذکر ہی نہیں کیا۔

کیا نہیں دیکھتے ماہ رمضان میں تراویح کے بعد وتر پڑھی جاتی ہے اس کا کیا مطلب؟

اگر رات کے آخری حصہ میں نہ اُٹھ سکتا ہو، وہ سونے سے پہلے کچھ رکعتیں تہجد کی نیت سے پڑھے اس کے بعد وتر ادا کرلے تاہم آخری رات میں اُٹھنا سنت ہے اس کی کوشش کرنی چاہیے۔ہم تو متابعت کے بدلے ہزار شب بیداری کو بھی نہ خریدیں۔ حق تعالیٰ جناب سرور کائنات ﷺ کی متابعت ہمارے نصیب کرے۔

قرآن مجید و ماہ رمضان میں مناسبت:

قرآن مجید کمالاتِ ذاتیہ شیونیہ اَصلیہ کا جامع ہے اور رمضان کمالاتِ صفاتیہ ظِلیہ کا جامع ہے،یعنی برکاتِ ذاتی واصلی قرآن میں ہیں اور برکاتِ صفاتی وظلّی رمضان میں ہیں، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ تمام سال کی برکتیں ماہِ رمضان میں نازل ہوتی ہیں اور اس کے بعد دوسرے مہینوں کو تقسیم ہوتی ہیں۔

واضح ہو کہ قرآن مجید تمام کمالاتِ ذاتی وشیونی کو حاوی ہے،یعنی شان الکلام تمام شیوناتِ ذاتیہ کو اور صفت الکلام تمام صفاتِ ثمانیہ کو شامل ہے، کیونکہ ذاتِ حق تعالیٰ کی ہر شان اور صفت کامل ہے اور نقص سے مُبّرا ہے۔

قرآن و رمضان دونوں شفاعت کریں گے:

حضور سرور عالم ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلصِّيَامُ وَالقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلعَبْدِ﴾ یعنی (روزہ اور قرآن بندہ کے لیے شفاعت کریں گے) چونکہ روزے کا فردِ کامل ماہِ رمضان ہے، لہٰذا رمضان وقرآن دونوں شفاعت کرنے والے ہیں۔ثابت ہوا کہ برکت اور شفاعت کے کمالات اصلیت اور ظلیت کے فرق ساتھ قرآن اور رمضان دونوں میں مشترکہ طور موجود ہیں اور دونوں کے مابین مناسبت کی خبر دیتے ہیں۔قرآن کمالاتِ ثمانیہ کا جامع

ہے اور رمضان کمالات کا نتیجہ ہے۔

قرآن صفۃُ الکلام کا مظہر ہے اور رمضان صفۃُ الکلام کا اثر ہے۔قرآن کا مبدأ فیض بھی صفت الکلام ہے اور رمضان کا مبدأ فیض بھی صفۃُ الکلام ہے۔

قرآن کے انوار وتجلیات ہر وقت ارواحِ بشریہ کی طرف فائض و جاری رہتے ہیں، مگر علائق بشر یہ ان کے وُرود وظہور کے راستہ میں حاجِب و مانع ہوتے ہیں ان علائق کے اِزالہ کے لیے روزہ سب سے قوی اور موَثر ذریعہ ہے۔

اس حقیقت کو جان لینے سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کے انوار و برکات ماہِ رمضان میں خصوصی طور پر روزہ داروں کے قلوب و ارواح پر وارد ہوتے رہتے ہیں اوراس آیت قرآنی کے مطابق ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ رمضان کے مہینہ میں نزولِ قرآن کی حکمت میں یہی مناسبت کارفرما معلوم ہوتی ہے۔

متوسط اور منتہی سالک کے لیے قرآن:

مبتدی کو چاہیے کہ فرائض اور سنن کو مختصر کرے۔اور دوسرے اوقات ذکرِ الٰہی میں گزارے متوسط کے لیے ضروری ہے کہ فرائض اور سنن کی ادائیگی کے بعد تلاوت قرآنِ مجید کرتا رہے۔ وہ خاصیت جو مبتدیوں کو ہمیشہ ذکر سے میسر آتی ہے۔متوسطین کو تلاوتِ قرآن مجید سے حاصل ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے زائد کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی مختلف المعانی آیات کی تلاوت سے صفاتِ مختلفہ کی تجلیات حاصل ہوتی ہیں۔منتہی حضرات کے لیے جن کے لیے ذکر کا نور ان کی ذاتی صفت بن چکی ہے۔ کامل تر عمل نماز میں قرآن کی تلاوت ہے۔کیونکہ یہ عبادت تامّہ اور جامعہ ہے۔

اگر کوئی شخص قرآن کے معانی نہیں جانتا، اسے چاہیے کہ دل کو تلاوت کرتے وقت قرآن کی آیات پر مذکور رکھے۔ اور کوشش کرے کہ نفس کے وسواس اسے ادھر اُدھر نہ لے جائیں۔ دل نورِ تعظیم اور توقیر سے آراستہ رکھے۔ اور اس کے دل میں عظمتِ قرآن طاری رہے، کیونکہ قرآن مجید حق تعالیٰ کا کلام ہے، اور اس کی صفت ہے، اور پھر قدیم ہے، اگر ان حروف کے معانی کی حقیقت ظاہر ہو جائے، سات زمین اور سات آسمان اس کی تجلی کی تاب نہیں لا سکیں گے۔

اگر کوئی شخص ایک دوائی پی لیتا ہے، اور اسے اس بات کا علم نہ ہو کہ کون سی دوائی ہے نام نہیں جانتا، تاہم اس پر اس کا اثر ضرور ہو گا۔ اسی طرح قرآن کا اثر بہر حال ہوتا ہے، قرآن کا ایک ایک حرف ایک پہاڑ کی مانند ہے، جو انسانی وجود پر گرتا ہے، اور اسے فنا کر کے رکھ دیتا ہے، جب قرآن مجید کا نور دل کے نور سے ملتا ہے، تو نورانیت زیادہ ہوتی ہے۔

رات کے وقت قرآن مجید کا تمام وظیفہ (۱) سورۂ فاتحہ (۲) آیت الکرسی (۳) خاتمہ سورۂ بقرۃ (۴) " قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ " تین بار (۵) " قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ " تین بار۔ دن کے وقت فجر کے بعد سورۂ یٰسین کافی ہے، جس وقت تین دل جمع ہو جائیں، تو بندۂ مومن کے کام بن جاتے ہیں، دلِ قرآن، دلِ مومن اور دلِ شب۔

قرآن کریم کے ساتھ ہمارا برتاؤ:

رمضان میں تراویح میں جو قرآن پڑھا جاتا ہے اکثر حافظ صاحبان تیز رفتار سے قرآن پڑھتے ہے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں کرتے، سننے والوں کو سوائے " یعلمون "، " تعلمون " کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ایسا پڑھنا حرام ہے، پڑھنے والوں کو یہ نہیں پتہ کہ کس کا کلام پڑھتے ہے، ان کو کوئی احساس نہیں، سننے والے حضرات کو بھی کوئی احساس نہیں ہوتا، وہ چاہتے ہیں کہ تیز پڑھا جائے، ان لوگوں کو نہ کلام کا پتہ نہ کلام

والے کو جانا، اپنے معشوق کے خط کو تو بڑے دھیان سے پڑھتے ہو، اے نادان! اتنی بھی وقعت اور قدر نہیں ترے دل میں؟ تو کیا سمجھے گا قرآن کی حقیقت کو۔

کلام اللہ کی ہیبت اور دبدبہ شاہی فرمان کی طرح ہے:

جو شخص بھی قرآن کو سنے گا اور اس کے معانی کو دل پر جاری کرے گا، تو اسے لازمی طور پر یہ محسوس ہو جائے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کیونکہ جو عظمت اس میں پائی جاتی ہے اور جو ہیبت اس سے طاری ہوتی ہے وہ عظمتِ ربوبیّت، اُلوہیت کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی، چنانچہ جب ایک عقلمند اور ذی فہم انسان کسی دنیاوی بادشاہ کا کلام یا سرکاری خط کا مضمون سن لے، پھر اس کے بعد اس کی رعیت کا کلام سنے تو بادشاہ کے کلام میں ایک خاص بات پائے گا، جس سے وہ پہچانا جائے گا، حتیٰ کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ وہ شخص نابینا ہے اور ایک جگہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے ہوں اور بادشاہ بھی اُن میں چھپ کر بیٹھا ہو اور باری باری تقریر کریں، تو یہ اندھا بادشاہ کے کلام کو دوسروں کے کلام سے پہچان لے گا اور اس میں قطعاً شک و شبہ نہ ہوگا، جب فانی کا فانی کے ساتھ یہ رنگ ہے تو کلامِ قدیم کا کیا رنگ ہوگا صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن ہی سے اپنے پروردگار کو پہچانا، اس کی صفات کو پہچانا اور جس ربُوبیت کا وہ مستحق ہے اس کو پہچانا، قرآن کا محض سن لینا ہی ان کے لیے حق تعالیٰ کا علم الیقین حاصل کرنے میں معانیہ اور مشاہدہ کا قائم مقام ہو گیا، یہاں تک حق تعالیٰ ان کے نزدیک ایسا بن گیا، جیسا ہم نشین اور کسی سے اس کا ہم نشین چھپا نہیں ہوتا۔

کسبی توجہ کی برتری طبعی توجہ پر:

کچھ لوگ جو فطری طور پر ہی حضور اور توجہ کا ملکہ رکھتے ہیں اور ان کی اس توجہ میں

کسب کو کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس کا راز یہ ہے کہ روح کو بدن کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پہلے ایک قسم کی توجہ اور حضور حاصل ہوتا ہے جب اسے بدن عنصری کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے اور عشق و محبت کی نسبت درمیان میں آجاتی ہے تو روح پوری طرح سے بدن کی طرف ایسی متوجہ ہو جاتی کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے گذشتہ احوال کو بالکل فراموش کر دیتی ہے، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جنھیں کسی دوسرے امر کی طرف توجہ غالب ہونے کی وجہ سے سابقہ توجہ بالکل فراموش نہیں ہوتی، اور بدن کے ساتھ تعلق ہو جانے کے باوجود اس کا اثر باقی رہ جاتا ہے، لہٰذا لامحالہ ان کی یہ توجہ عمل اور کسب کی محتاج نہیں ہوتی، لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ احوال سابق کو پوری طرح سے فراموش کر چکے ہوں۔ اگر بدن کے ساتھ تعلق قائم ہو جانے کے بعد انہیں کوئی عروج نصیب ہوتا ہے تو وہ پہلی جماعت سے سبقت لے جاتے ہیں۔ اگر چہ پہلی جماعت بھی ترقی کرتی ہے، کیونکہ ان کا احوال سابق کو بالکل فراموش کر دینا اور پھر اپنے معشوق، یعنی بدن کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جانا، ان کی لطافتِ استعداد کو بتاتا ہے کہ وہ جس کی طرف بھی متوجہ ہو جاتے ہیں، وہی بن جاتے ہیں اور اس کے ماسوا کو بالکلیہ فراموش کر دیتے ہیں، برخلاف اس صورت کے جس میں آدمی احوالِ سابقہ کو نہیں بھولتا، کیونکہ اس سے معشوق کی طرف متوجہ ہونے میں نقص سمجھا جاتا ہے، واللہ سبحانہ اعلم۔

صورتِ ایمان اور حقیقتِ ایمان:

" لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ " کے ذکر سے مقصود، باطل معبودوں کی نفی کرنا ہے، خواہ وہ آفاقی ہوں اور خواہ انفسی۔ آفاقی معبودوں سے مراد، کافروں اور فاجروں کے باطل معبود ہیں۔ اور معبود انفسی سے مراد، نفسانی خواہشات ہیں، جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ ﴾ یعنی (تو کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا

جنہوں نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے) ایمان ،یعنی تصدیق قلبی جس کا ہمیں ظاہر شریعت نے مکلّف بنایا ہے،آفاقی معبودانِ باطل کی نفی کے لیے کافی ہے، لیکن انفسی معبودانِ باطل کی نفی کے لیےنفسِ امّارہ کا تزکیہ درکار ہے، جو اہل اللہ کے راستہ پر چلنے سلوک کا حاصل ہے ۔ایمانِ حقیقی ان دونوں قسم کے معبودانِ باطل کی نفی سے وابستہ ہے،لیکن ایمان کے متعلق ظاہر شریعت کا حکم محض معبودانِ آفاقی کے ابطال ونفی سے بھی ثابت ہو جاتا ہے،مگراس قسم کا ایمان محض ایمان کی صورت ہوتی ہے، ایمان کی حقیقت تو معبودانِ انفسی کے ابطال پر ہی منحصر ہےصورت ایمان کے تو زائل ہونے کا احتمال ہے ،لیکن حقیقتِ ایمان اس احتمال سے محفوظ ہے ، کیونکہ صورتِ ایمان میں اول تو نفسِ امارہ ہی اپنے انکار اور کفر سے باز نہیں رہتا ، اس سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ نفس امارہ کی مخالفت کے باوجود قلب میں ایک گونہ تصدیق پیدا ہو جاتی ہے ، لیکن ایمانِ حقیقی میں خودنفس امّارہ ، جو اپنی ذات کے اعتبار سے شرکش ہے مطیع وفرماں بردار ہو کر شرکشی سے باز آجاتا اور شرفِ ایمان سے مشرف ہو جاتا ہے۔

ان تکلیفاتِ شرعیہ سے مقصود بھی نفس کو عاجز کرنا اور اسے مطیع کرنا ہے، کیونکہ قلب تو بذاتِ خوداحکامِ الٰہی کا مطیع وفرماں بردار ہی ہوتا ہے، اگر قلب میں کسی قسم کی خباثت پیدا ہوتی ہےتو وہ نفس کی ہمسائیگی ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، لہٰذا تزکیۂ نفس ضروری ٹھرا تاکہ ایمان کی حقیقت حاصل ہو سکے اور وہ زوال سے محفوظ ہو جائے ، تزکیۂ نفس کا تعلق درجۂ ولایت سے ہوتا ہے، جس سے مراد فنا اور بقا ہے، جب تک کوئی آدمی درجۂ ولایت تک نہ پہنچ جائے اطمینان نفس ممکن نہیں ہے ، اور جب تک نفس اطمینان سے وابستہ نہ ہو جائے حقیقتِ ایمان کی خوشبو بھی جان کے دماغ تک

نہیں پہنچ سکتی۔اور وہ زوال کے اندیشہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

﴿ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهُ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ یعنی (یادرکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غم گین ہوگے)۔

طریقت اور حقیقت سے شریعت کا تعلق:

شریعت ،طریقت، حقیقت ،حقیقت سے مراد شریعت کی حقیقت ہے یہ نہیں کہ حقیقت ،شریعت سے الگ کوئی چیز ہے ۔طریقت سے مراد، حقیقتِ شریعت تک پہنچنے کا طریقہ ہے شریعت اور حقیقت سے الگ کوئی اور چیز نہیں ہے ۔شریعت کی حقیقت صحیح طور پر حاصل ہونے سے پہلے صرف شریعت کی صورت کا حصول ہوتا ہے اور شریعت کی حقیقت کا حصول، اطمینانِ نفس کے مقام میں ہوتا ہے، جبکہ آدمی کو درجۂ ولایت میں رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

درجۂ ولایت میں رسائی اور اطمینانِ نفس حاصل ہونے سے پہلے شریعت کی صورت ہوتی ہے، جیسا کہ ایمان کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے کہ اطمینانِ نفس سے پہلے ایمان کی صورت ہوتی ہے اور اطمینان کے بعد ایمان کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔

مراتبِ فنا:

''فنا'' سے مراد حق تعالیٰ کی ہستی کے شہود کے غلبہ کی وجہ سے ماسوائے حق تعالیٰ کو بھول جانا ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ روحِ انسانی مع سِرّ، خفی اور اخفیٰ کے بدن کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پہلے اپنے صانع حقیقی کا یک گونہ علم رکھتی اور بارگاہِ قدس کے ساتھ اسے ایک طرح کی حاصل تھی اور چونکہ اس کی فطرت میں ترقیات کی استعداد رکھ دی گئی تھی اور ان استعدادوں کا ظہور بدنِ عنصری کے ساتھ تعلق ہونے پر

منحصر تھا اس لیے لا محالہ اوّلاً اسے فریفتگی اور محبت کی صفت عطا گئی۔ پھر اس کے بعد کے درجہ میں اس کی توجہ کو اس مادی جسم کی طرف پھیر دیا گیا۔اور ان دونوں روح اور جسم میں محبت کا ارتباط اور تعلق بدرجۂ کمال پیدا کر دیا گیا۔چنانچہ روح نے اس تعلق کی بنا پر اپنے کمالِ لطافت کے باوجود اپنے آپ کو اس محبوب ظلمانی (جسم) میں گم کر دیا۔اور اپنے وجود کو مع اس کے توابع سِرّ ،خفی اور اخفیٰ کے اس ظلمانی محبوب ،یعنی جسم میں فنا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے عقل مندلوگ اپنے آپ کو جسم کے علاوہ کچھ اور نہیں سمجھتے اور جسم کے علاوہ کسی اور بات کا اثبات نہیں کرتے۔

فنائے جسمی:

حق تعالیٰ جوسب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے،اپنے کمالِ رحمت سے انبیاء علیہم السلام کی زبانی جوکہ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور ان سب پر حق تعالیٰ کی عام رحمتیں اور سلامتیا نازل ہوں اور خصوصیت کے ساتھ ان میں سے افضل ترین اور ان کے خاتم پر،لوگوں کو اپنی بارگاہِ قدس کی طرف بلایا اور اس تعلقِ ظلمانی سے منع فرمایا، جس کسی کو سعادتِ ازلی حاصل ہوگئی اس نے اُلٹے پیروں واپس ہوکر عالمِ سفلی کی محبت کو الوداع کہا اور عالمِ بالا کی راہ اختیار کی یہاں تک کہ اس محبوب ظلمانی یعنی جسدِ عنصری کے ساتھ مکمل نسیان میسر آ گیا اور اس کی محبت کا کوئی اثر باقی نہیں رہا،اس وقت فنائے جسدی حاصل ہوگئی اور دو قدم جن کا اس راہِ طریقت میں اعتبار کیا گیا ہے، جیسا کہ کہا گیا ہے''دو قدم ہی تو ہیں ،بس تم پہنچ گئے'' ان دو قدموں میں سے اس نے ایک قدم کو انجام تک پہنچا دیا۔

فنائے روحی:

اس کے بعد اگر محض فضل خداوندی کی بنا پر اس مقام سے ترقی حاصل ہو جائے تو سالک خود روح کے وجود اور اس کے وجود کے توابع کو بھی بھولنا شروع کر دیتا ہے اور آناً فاناً یہ بھول بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سالک اپنے آپ کو بالکلیہ بھلا دیتا ہے اور بجز بارگاہِ حق تعالیٰ کے شہود کے اور کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس نسیان کو فنائے روحی سے تعبیر کرتے ہیں جو ان دو قدموں سے دوسرا قدم ہے اور روح کے عالمِ سفلی کی طرف نیچے اترنے کا مقصود فنا کی اسی دوسری قسم کا حاصل کرنا تھا اس کے بغیر یہ دولت میسر نہیں آ سکتی تھی۔

ایک دقیق راز:

اور اس میں جو دقیق راز ہے وہ با کمال اہل اللہ پر مخفی نہیں ہے، اور وہ راز یہ ہے کہ روح کے واسطے اپنے آپ کو بھول جانے کے لیے کسی غیر کے ساتھ شدید محبت اور کمال مودت کا حاصل ہونا ضروری ہے۔ اور محبت کا غلبہ جیسا کہ حاضر کے حق میں ہوتا ہے اس کے مثل غائب کے حق میں نہیں ہوا کرتا، لہٰذا اولاً تو روح نے حاضر میں کمالِ محبت کو حاصل کیا جو خود روح کو فنا کر دینے والا تھا، پھر دوسرے درجہ میں اپنے آپ کو فنا کرنے کے لیے غیب میں اسی محبت سے کام لیا، یہ وہ دقیق راز ہے جسے اکابرِ عارفین کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے۔

فنائے قلبی:

رہ گیا قلب جسے حقیقتِ جامعہ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو وہ اس وقت روح ہی کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا جب وہ ترقی کر کے اپنے مقام سے روح کے مقام میں پہنچ گیا،

تو اسے بھی روح کی متابعت میں یہی نسیان حاصل ہو گیا، اور اس کے فنا کے ساتھ خود بھی فنا ہو گیا۔

فنائے نفس:

رہ گیا نفس تو اس کا تزکیہ مقامِ قلب میں پہنچ جانے کے بعد ہوتا ہے، اور یہ اس کے بعد پیش آتا ہے جب قلب ترقی کر کے خود، مقامِ روح میں پہنچ جاتا ہے۔ صاحبِ عوارف جو شیخ الشیوخ ہیں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، نسیانِ مذکور کو مادّۂ نفس میں ثابت نہیں کرتے، وہ نفس کی کمال پاکیزگی اسی میں بتاتے ہیں کہ نفس، مقامِ قلب میں رسائی حاصل کر لے، لیکن یہ فقیر کہتا ہے کہ نسیانِ مذکور مادّۂ نفس میں بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن نفس کے ترقی کر کے مقامِ قلب سے مقامِ روح میں پہنچ جانے کے بعد ہوتا ہے، لہٰذا نفس کے لیے بھی فنا متحقق ہوتی ہے، جیسی کہ قلب کو ہوتی ہے۔ یہ نفس ہی تو ہے جو حصولِ اطمینان کے بعد اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور مقامِ قلب سے مقلّب قلب (دل کو پھرنے والے یعنی حق تعالیٰ) کے ساتھ تعلق استوار کر کے راضی اور مرضی بن جاتا ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کی شان میں فرمایا ہے ﴿ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ ﴾ یعنی (اے نفسِ مطمئنہ! چل اپنے پروردگار کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی)، البتہ جب تک وہ مقامِ قلب میں رہتا ہے جس کی شیخ الشیوخ نے خبر دی ہے اور جس کا نام انہوں نے نفسِ مطمئنہ رکھا ہے، اس وقت تک نسیانِ مذکور اس کے حق میں مفقود ہوتا ہے۔ وہ تزکیہ یافتہ تو ہو گیا ہے، لیکن ابھی تک اطمینان کے ساتھ اسے وابستگی حاصل نہیں ہوئی۔ مقامِ قلب تو تغیر وتبدل کا مقام ہے، اطمینان اس کی ضد ہے، لہٰذا

اس مقام سے نکل جانا اطمینان کی شرط ہے۔﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ (یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑے ہی فضل والا ہے)۔

فنائے سِرّ و خفی اور اخفیٰ:

نیز وہ تینوں مراتب جو روح سے اوپر ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے کہ روح کے فنا ہو جانے سے ان کی فنا لازم نہیں آتی، البتہ اگر روح کے نیچے اترنے کے وقت ان تینوں مرتبوں نے بھی کلی طور پر یا جزوی طور پر روح کی موافقت میں نیچے اتر آئے ہوں اور روح کی محبت کا غلبہ ان میں بھی سرایت کر گیا ہو اور اپنی ذاتوں کے نسیان کے مرتبہ تک انہیں پہنچا دیا ہو، تو ہوسکتا ہے کہ واپس لوٹتے وقت ان تینوں کو بھی کلی یا جزوی طور فنا حاصل ہو جائے اور روح کی طرح وہ سب بھی فانی ہو جائیں۔

علامتِ فنائے قلب:

واضح رہے کہ خطرات کا قلب سے بالکلیہ اُٹھ جانا، حق تعالیٰ کے ماسوا کو بھول جانے کی علامت ہے، کیونکہ خود خطرۂ قلبی سے مراد دل میں کسی چیز کا حاصل ہونا اور اس چیز کا خیال دل میں گذرنا ہے، خواہ خود بخود وہ آیا ہو، یا یاد کرنے سے آیا ہو، اور یہ کسی چیز کا دل میں آنا اور اس کے خیال کا دل میں گذرنا ہی علم ہے، کسی چیز کے خیال کا دل میں آنا جب بالکل ہی مٹ جائے، یعنی اس حد تک کہ اگر اسے بہ تکلف بھی لانا چاہیں تو نہ آئے اور اگر اسے یاد کرائیں تب بھی یاد نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ علم بالکلیہ زائل ہو گیا۔ اور یہ زوالِ علم وہی نسیان ہے جو فنا میں معتبر ہے۔ یہ ہے مقامِ فنا کی وضاحت کا آخری بیان، اگر توفیقِ خداوندی سبحانہٗ مدد فرمائے تو یہ فقیر اس سے

بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کرے گا، کیونکہ یہ طالبین وسالکین کے غلطی میں مبتلا ہونے کا مقام ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم بالصواب

یادداشت:

اس سے مراد سالک ذات بے مثل اور بے کیف حق تعالیٰ کی طرف بغیر ملاحظہ الفاظ وخیال کے متوجہ رہنا ہے۔

بعض مشائخ کے نزدیک **یادداشت** " حفظ القلب علی شهود تجلّی الذات " سے عبارت ہے، لیکن یادداشت سے مراد ذکر نہیں، بلکہ دوامِ حضور وآگاہی علیٰ سبیل الذوق ہے۔

غرض یہ کہ یادداشت سالک کے قلب پر استیلائے شہودِ حق بتوسطِ محبت ذاتی ہو جائے اور وہ ہر حال میں بہ سبیل ذوق ذات کے ساتھ محو اور متوجہ رہے یہ مقام، مرتبہ حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جس میں حجابات شیونیہ اور حجابات اعتباریہ مرتفع ہو جاتے ہیں، یہ وہ انتہائی مرتبہ ہے جہاں پہنچ کر سالکینِ نقشبندیہ تجلی ذاتی دائمی سے شاد کام ہوتے ہیں، جبکہ دیگر مشائخ نے تجلی ذاتی برقی کو نہایۃ النہایت قرار دیا ہے ہوسکتا ہے اسی بنا پر حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے نسبتِ نقشبندیہ کو تمام نسبتوں سے بالاتر قرار دیا ہے، یہ وہ دولت ہے جو فنائے اتم اور بقائے اکمل کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

حضرات خواجگانِ نقشبندیہ رحمہ اللہ علیہم اجمعین کے یہاں یادداشت کو نسبتِ حضور وآگاہی، حضورِ ذاتی دائمی اور دوامِ حضور مع اللہ بلا غیوبیہ بھی کہا جاتا ہے اور یہ مقامِ سالکین کو ولایتِ محمدیہ ﷺ کے مرتبہ میں حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی صوفی وسالک اس مرتبہ کا خواہشمند ہے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہے تو اس پر

حضور اکرم ﷺ کی کامل محبت و متابعت اختیار کرنا لازم ہے۔ نیز وہ سنت و شریعت کی پابندی کا خوب اہتمام کرے، کیونکہ یہ مقام عزیز الوجود اور کمیاب و نادر ہے۔

جاننا چاہیے کہ عامۃ الناس سراپا غفلت ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا باطن، ان کے ظاہر سے تفریق یافتہ اور الگ نہیں ہوتا، اس لیے ان کی غفلت ظاہری، غفلت باطنی کا موجب ہوتی ہے، جبکہ عرفائے کاملین کا باطن ان کے ظاہر سے تفریق یافتہ اور جدا ہوتا ہے بہ نسبت عامۃ الناس کے ان کی غفلت ظاہری ان کے باطن میں سرایت نہیں کرتی۔

یادداشت اور یادکرد میں فرق:

یادداشت اور یادکرد میں فرق یہ ہے کہ یادکرد میں کبھی غیبت اور کبھی حضوری ہوتا ہے، بلکہ غیبت زیادہ اور حضور کم ہوتا ہے اور یادداشت میں حضور ذات دائمی ہوتا ہے اور اسی کو تجلی ذاتی دائمی کہتے ہیں، جبکہ یادکرد تجلی ذاتی برقی سے عبارت ہے۔ درحقیقت تجلی برقی، تجلی ذاتی نہیں، کیونکہ تجلی ذاتی جب ظہور کرتی ہے پھر کبھی غائب نہیں ہوتی اور تجلی برقی کبھی ظاہر ہوتی ہے کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ اَکابر مشائخ نقشبندیہ علیہم الرحمہ کی خاص نسبت تجلی ذاتی دائمی ہے، لیکن دوسرے مشائخ نے تجلی ذاتی برقی کو نہایۃ النہایت قرار دیا ہے۔

سالک کے احساسات:

جب سالک کو عالمِ قدس تک وصل نصیب ہو جاتا ہے تو وہ باطنی طور پر اپنی روح کے متعلق یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ میرے جسم میں داخل ہے اور نہ جسم سے باہر ہے نہ جسم سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا ہے۔

☆ ...... جب سالک واصل کو روح کے جسم کے ساتھ اندر، باہر، اتصال و انفصال کا

کچھ بھی علم نہیں ہوتا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق صرف جسم کی اصلاح و دوستی کے لیے ہے، بلکہ سالک کو اپنے اندر ایک اور غرض ہوتی ہے کہ روح کی کلی طور پر جسم سے بالکل مفارقت مقصود نہ تھی، بلکہ روح کے مرتبۂ کمال تک پہنچ جانے کے بعد پھر جسم کی طرف عود کرنا تھا، تاکہ جسم صلاح و خیر و دورستگی قائم رہے اور اگر روح کا جسم کے ساتھ یہ تعلق نہ ہوتا تو سارا جسم شر و نقصان و فساد کا محل ہو جاتا خیر و صلاح اس میں بالکل نہ رہتی۔

جس طرح روح کا جسم کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے، ایسے ہی حق تعالیٰ کا روح اور کائنات کے ساتھ تعلق قائم ہے، جب سالک واصل روح کے تعلق یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ نہ جسم کے اندر ہے، نہ باہر ہے، نہ متصل ہے، نہ منفصل ہے، وہ حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کہو۔

لطائف کا غالب و مغلوب ہونا:

جب سالک راہِ طریقت، سنت و شریعت کے احکام اور شیخ کے بتائے ہوئے اسباق کو پابندی کے ساتھ بجالاتا ہے، تو اس پر احوال و کیفیات کا ورود ہوتا ہے، تو سالک خوشحال اور محظوظ ہوتا ہے، لیکن اچانک وہ احوال غائب ہو جاتے ہیں اور کیفیات پوشیدہ ہو جاتی ہیں، تو سالک پریشان ہو جاتا ہے یوں ہی بار بار ان احوال و کیفیات کا ظہور و اخفاء ہوتا رہتا ہے، باطنی حالت ایک جیسی نہیں رہتی اس کی کیا وجہ ہے؟

انسان عالمِ خلق اور عالمِ امر کے سات لطائف کا مجموعہ ہے: (۱) قلب (۲) روح (۳) سِرّ (۴) خفی (۵) اخفیٰ (۶) نفس (۷) قالبیہ۔

سات لطائف میں سے کبھی لطیفۂ قلب کو دیگر لطائف پر غلبہ و تفوق حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے لطیفے مغلوب ہو جاتے ہیں، تو جو کیفیت اس لطیفہ پر طاری ہوتی

ہے وہی کیفیت دیگر لطائف پر طاری ہونے کی وجہ سے سالک خوشحال فرحت سے سرشار ہوتا ہے، بقدر استعداد اس لطیفہ کی دوسرے لطائف پر حکومت وغلبہ رہتا ہے، کچھ عرصہ بعد حق تعالیٰ کی حکمت وعنایت سے کوئی اور زیادہ قوی لطیفہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پہلے غالب لطیفہ کو مغلوب کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر لطائف پر بھی چھا جاتا ہے، اس طرح سب لطائف کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے، اب سالک پر نئی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ پہلی کیفیت سے مختلف ہوتی ہے، یوں ان لطائفِ سبعہ کا باہمی غالب ومغلوب کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

لطائف کے ایک دوسرے پر غالب ومغلوب ہونے کے دوران سالک کبھی کیفیتِ قبض سے دوچار ہوتا ہے اور کبھی کیفیتِ بَسْط سے سرشار ہوتا ہے، اس دوران شیخ کی صحبت کے اثرات وتوجہات کی بدولت سالک کا دینی کاموں میں رجحان زیادہ ہو جاتا ہے، اعمالِ صالحہ اور افعالِ پسندیدہ بجالانے میں جوش وخروش ہوتا ہے، اسے کیفیتِ انبساط کہتے ہیں، مگر بعض اوقات حکمتِ الٰہیہ کے تحت وہ کیفیت سلب کر لی جاتی ہے، جوش مانند پڑ جاتا ہے، جذبات سرد ہو جاتے ہیں، اسے انقباض کہا جاتا ہے، یہ کیفیت کبھی نقصان دہ بھی ثابت ہوتی ہے، سالک اور صوفی جہالت کی بنا پر شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، داڑھی منڈا کر سر سے عمامہ اتار پھینکتا ہے، نمازیں ترک کر کے گمراہ ہو جاتا ہے۔ العیاذ باللہ

لطائف کے ایک دوسرے پر غالب ومغلوب ہونے کے دوران سالکین پر مختلف کیفیات واحوال وارد ہوتے رہتے ہیں۔ زیادہ استعداد والے لطیفے پر اَنوار کا نزول اور احوال ورود ہو جائے، تو وہ دیگر لطائف کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ جب اس لطیفہ کا غلبہ وتفوق وحکومت ختم ہو جاتی ہے، تو وارد شدہ حال غائب اور کیفیت زائل ہو جاتی ہے۔

اور اگر کچھ عرصہ بعد وہی حال دو بارہ سالک پر آ جائے تو اس وقت سالک کی حالت و کیفیت دو حال سے خالی نہیں ہوگی ، اگر اسی پہلے لطیفہ پر ہی احوال عود کر آئیں تو سالک کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی باطنی اِرتقاء رُکی ہوئی ہے ، مزید ترقی کی طرف گامزن نہیں ۔ اور اگر کسی دوسرے لطیفہ پر وارد قوی نازل ہو اور وہ لطیفہ جوش مار کر دیگر لطائف پر اپنا رنگ جما لے ، تو اس وقت سالک کو باطنی عروج اور روحانی ترقی نصیب ہو رہی ہے ۔ دوسرے لطیفہ کا معاملہ بھی پہلے لطیفہ کی مانند ہی ہے ۔ اگر یہی صورت حال باری باری تمام لطائف پر اصلی اور حقیقی طور پر وارد ہوتی رہے اور تمام لطائف منصبغ اور ممتزج ہوتے جائیں اور جملہ لطائف کو حکمرانی اور غلبہ کی دولت نصیب ہو جائے تو اب سالک اور صوفی حال سے مقام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ، یعنی درجہ بدرجہ لطائف کی رنگت و حکومت کے دوران سالک صاحبِ حال ہوتا ہے اور لطیفوں کے غلبے کے زوال سے محفوظ ہو کر ایک مقام پر قرار و تمکین مل جانے پر صاحبِ مقام بن جاتا ہے ۔ آگے حقیقتِ حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔

اربابِ تلوین و تمکین :

اِنہی تغیراتِ احوال کو اصطلاحِ تصوف میں تلوین کہا جاتا ہے ، صاحبانِ تلوین صوفیاء ولایتِ صغریٰ کے مرتبہ میں ہوتے ہیں ، اربابِ تلوین کو صاحبانِ حال بھی کہا جاتا ہے ، جن صوفیاء کے احوال ایک جگہ پر بدستور قائم رہیں ، انہیں صاحبان تمکین کہا جاتا ہے ، صاحبِ تمکین کو صاحبِ مقام کہا جاتا ہے ، صاحبِ مقام کو صاحبِ حال پر فضیلت حاصل ہے ۔

صوفیہ اور متکلمین میں معرفت کے متعلق فرق:

معرفتِ خداوندی صوفیائے کرام اور اکثر متکلمین کے نزدیک بالاتفاق واجب ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے، لیکن صوفیہ و متکلمین کا اس طریقہ میں اختلاف ہے جو معرفت کی طرف پہنچانے والا ہے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ معرفت کا طریقہ ریاضت اور تصفیۂ باطن ہے، اور متکلمین فرماتے ہیں کہ اس کا طریقہ غور وفکر اور استدلال ہے۔ اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ان دونوں جماعتوں کے درمیان جو جھگڑا اور فرق ہے وہ صرف لفظی ہے، یعنی یہ اختلاف محض لفظِ ''معرفت'' کی تفسیر پر مبنی ہے، صوفیائے کرام تو معرفت سے ایسی بسیط ذات کی دریافت مراد لیتے ہیں جس کا تعلق وجدان ہو اور ظاہر ہے کہ یہ تصدیقِ ایمانی کی صورت سے مختلف چیز ہے۔ اور متکلمین، معرفت سے تصدیقِ ایمانی کی صورت مراد لیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے معنی کے لحاظ سے معرفت حاصل کرنے کا طریقہ، ریاضت اور تصفیۂ باطن ہی ہے۔ اور تصدیقِ ایمانی کی صورت کے حاصل کرنے کا طریقہ، غور وفکر اور استدلال ہی ہوسکتا ہے۔ اور وہ جو علماء نے فرمایا ہے کہ ''سب سے پہلی چیز جو ایک مکلّف شخص پر واجب ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے''، تو وہاں معرفت سے مراد دوسرے معنی کی معرفت ہی ہے، پہلے معنی کی نہیں، کیونکہ پہلے معنی کے لحاظ سے معرفت کا حصول حق الیقین میں ہوتا ہے، جو اہل اللہ کے کمال کا آخری نقطہ ہے۔

ہم ان دونوں معرفتوں کا فرق، ایک دوسری عبارت میں بیان کرتے ہیں:

صوفیائے کرام کی معرفت کو حق تعالیٰ کے ساتھ علمِ حضوری سے تعبیر کرتے ہیں جو کہ فنا اور بقا کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس معرفت کو پہچاننے اور پا لینے سے تعبیر

کرتے ہیں۔اور متکلمین کی معرفت سے مراد حق تعالیٰ کا علمِ حصولی ہے جو غور وفکر اور استدلال کا نتیجہ ہوتا ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر وہ علم جو خارج سے حاصل ہو،اس سے مراد شئ معلوم کی صورت کا حصول ہوتا ہے۔اس علم کو علمِ حصولی کہتے ہیں اور جس علم کی یہ کیفیت نہ ہو، یعنی وہ خارج سے حاصل نہ ہو، بلکہ خود صاحبِ علم کی ذات سے متعلق ہو اس علم کو علمِ حضوری کہتے ہیں۔اور جب عارف اپنی ذات وصفات کی فنا کے بعد بقاء باللہ سے مشرف ہو جاتا ہے اور اس کی ہستی اس کے وجودِ کونی سے بالکل ہی بے تعلق ہو جاتی اور حقیقت پر مطلع ہو جاتی ہے تو وہ لامحالہ علمِ حصولی سے علمِ حضوری کے مرتبہ میں منتقل ہو جاتا ہے اور جاننے سے پالینے کے درجہ میں رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ولایت کا انداز، عقل وفکر کے انداز سے بلند ہے، اور اس کا طریقہ کشفِ صحیح ہے۔غور وفکر اور استدلال کی اس مقام میں گنجائش نہیں ہے۔

اس فقیر کا جذب وسلوک:

جاننا چاہیے کہ عنایتِ الٰہی نے مجھے اپنی طرف کھینچا جیسا کہ مقامِ مراد پر فائز لوگوں کو کھینچا جاتا ہے، اس کے بعد میرے لیے اس جذبہ نے سلوک کی منزلوں کو طے کرنا نہایت ہی آسان کر دیا۔چنانچہ میں نے شروع شروع میں حق تعالیٰ کی ذات کو اشیا کا عین پایا، جیسا کہ توحیدِ وجودی کے مقام پر فائز حضرات نے ارشاد فرمایا، اس کی تفصیل تحریر میں نہیں آسکتی۔

اس کے بعد توحیدِ شہودی جسے فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ پہلا قدم ہوتا ہے جو ولایت کے درجات میں رکھا جاتا ہے اور یہی وہ سابق ترین کمال ہے جو ابتدا میں

حاصل ہوتا ہے ۔اور یہ مراتب مذکورہ میں سے کسی مرتبہ میں بھی کیوں نہ پیش آئے اوّلاً آفاق میں ہوا کرتی ہے اور پھر دوسرے درجہ میں انفس میں ہوا کرتی ہے۔

پھراس کے بعد میں نے بقا کی طرف ترقی کی جو ولایت میں دوسرا قدم ہوا کرتا ہے، پس میں نے اشیا کو دوبارہ دیکھا اور میں نے حق تعالیٰ کو ان اشیا کا عین پایا...... اس کے آگے تحریر میں لانا مناسب نہیں کیونکہ آج اس نسبت کا علم قلیل ترین حضرات کے سوا کسی کو اس مقام کے علوم و معارف کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی ، لہٰذا یہ ضعیف بھی اس مبحث کے متعلق کوئی بات نہیں کرتا ۔اس کے بعد مرتبۂ عوام کی طرف واپس آجانا ہوتا ہے ۔اور یہ مقام مخلوق کو حق تعالیٰ کی طرف دعوت دینے اور بلانے کا کامل ترین مقام ہوا کرتا ہے اور یہی منزل تکمیل وارشاد کی کامل ترین منزل ہوا کرتی ہے، تاکہ مخلوق کی طرف مناسبت مکمل ترین طریقہ پر حاصل ہو سکے ،کیونکہ کمالِ درجہ کا فائدہ پہنچانے اور فائدہ حاصل کرنے کا یہی تقاضا ہوتا ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے،اور اللہ تعالیٰ بڑے ہی فضل والا ہے، اور یہ تمام مذکورہ احوال اور تحریر کردہ کمالات مجھے حاصل ہوئے ہیں ، بلکہ ہر اس شخص کو حاصل ہوتے ہیں جو افضل الانبیاء اور اکمل البشر ﷺ کی متابعت کے ساتھ واصل ہوتا ہے ۔اے اللہ! ہمیں آپ ﷺ کی پیروی پر ثابت قدم رکھ اور ہمارا حشر آپ ہی کے زمرہ میں فرما۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

فضائلِ سلسلۂ نقشبندیہ:

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ چند فضیلتوں کے اعتبار سے باقی تمام سلسلوں سے ممتاز ہے اور اس طریقۂ عالیہ کو باقی تمام طریقوں پر ترجیح ہونا ظاہر ہے۔

یہ سلسلۂ عالیہ برخلاف دوسرے سلسلوں کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ختم ہوتا ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام بنی آدم میں سب سے افضل ہیں، اس طریقہ میں برخلاف باقی طریقوں کے آغاز ہی میں انجام مندرج ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں برخلاف دوسرے سلسلوں کے ان بزرگوں کے نزدیک جو شہود معتبر ہے وہ شہود دائمی ہے، جسے ان حضرات نے یادداشت سے تعبیر فرمایا ہے اور جو شہود دوام پذیر نہ ہو وہ ان حضرات کے نزدیک نا قابل اعتبار ہے۔

اور اس طریق کی منزلوں کو طے کرنا صاحبِ شریعت ﷺ کی مکمل پیروی کے بغیر میسر نہیں ہوتا، برخلاف دوسرے سلسلوں اور طریقوں کے کہ کسی قدر پیروی کے ساتھ یہ لوگ ریاضتوں اور مجاہدوں کی مدد سے دین سے بے تعلقی کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں اور یہ بزرگ محض جذبے کی مدد سے راہ کو طے کرتے ہیں اور دوسرے طریقوں میں پر مشقت ریاضتوں اور شدید مجاہدوں کے ذریعہ سے منزلیں قطع کرتے ہیں۔اور جذبہ محبوبیت کی صفت کو چاہتا ہے، جب تک سالک محبوب نہ بن جائے اسے جذبہ نہیں کرتے۔اور محبوبیت کی حقیقت محبوب رب العالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی متابعت اور پیروی سے وابستہ ہے۔آیت کریمہ: ﴿فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ یعنی (لہٰذا میری (نبی کریم ﷺ) کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا) اسی مضمون پر شاہد ہے، لہٰذا جس قدر متابعت کامل تر ہوگی اسی قدر جذبہ زیادہ ہوگا، اور جس قدر جذبہ زیادہ اسی قدر منزل کو قطع کرنا آسان تر اور تیز تر ہوگا، لہٰذا کامل متابعت اور پیروی ان بزرگوں کے طریقہ کی شرط ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکا ان حضرات نے عزیمت ہی پر عمل فرمایا ہے، حتیٰ کہ ذکر بالجہر کو بھی جو اس راہ میں بڑی عمدہ چیز ہے ان حضرات نے منع کر دیا ہے اور سماع اور رقص سے بھی ان حضرات نے اجتناب فرمایا ہے۔

نیز ظاہر ہے کہ جو کمال، متابعت پر مرتب ہوگا وہ تمام دوسرے کمالات سے بلند درجہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ہماری نسبت تمام نسبتوں سے بلند تر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے، لہٰذا طالبانِ حق کے لیے اور خصوصاً علماء کے لیے اس طریق کو اختیار کرنا زیادہ بہتر اور زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ راستہ انتہائی نزدیک تر اور مطلوب انتہائی طور پر بلند ہے حق سبحانہ تعالیٰ ہی توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

خسرانِ مخالفینِ نبی ﷺ:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اولادِ آدم کے سردار و آقا ہیں، آپ ﷺ ہی کی وہ ہستی ہے، مبارک ہے جس کے متعلق آپ ﷺ نے خود فرمایا ہے کہ ”ہم (دنیا میں) سب کے بعد آنے والے ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے“۔

اور آپ ﷺ نے فرمایا ”حق تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو مجھے ان کے بہترین (یعنی انسانوں) میں سے بنایا۔ پھر ان (انسانوں) کی دو جماعتیں بنائیں تو مجھے ان کی بہترین جماعت میں سے بنایا۔ پھر ان کے قبیلے اور خاندان بنائے تو مجھے ان میں سے بہترین خاندان سے بنایا۔ پھر ان کے گھرانے بنائے تو مجھے بہترین گھرانے سے بنایا، لہٰذا میں ان میں گھرانے کے اعتبار سے بہترین اور اپنی ذات کے اعتبار سے بہترین ہوں، جب لوگ (قیامت میں) اٹھائے جائے گے تو میں سب سے پہلا (قبر مبارک سے) باہر آنے والا ہوں گا، جب وہ (حق تعالیٰ کی حضوری میں) وفد کے طور پر جائیں گے تو میں ان کا پیشوا ہوں گا، جب وہ سب خاموش رہیں گے تو میں ان کا خطیب ہوں گا، جب وہ سب روک دیئے جائیں گے تو میری ہی سفارش قبول کی جائے گی۔ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو حق تعالیٰ مخلوق کو پیدا نہ کرتا اور نہ اپنی ربوبیت

کا اظہار فرماتا۔آپ ﷺ اس وقت بھی نبی تھے جبکہ حضرت آدم ہنوز مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔

لہٰذا اس روشن شریعت والی ہستی حضور انور ﷺ کے منکر اور اس ملتِ زہرا کے بانی رسول اللہ ﷺ کے مخالف ساری مخلوقات میں بدبخت ترین لوگ ہیں۔تعجب ہے کہ بعض ناپختہ اور ناقص پیر وشیخ جو اپنے خیالی کشف کو معتبر سمجھتے ہیں اس روشن شریعت کی مخالفت اور انکار میں پیش قدمی کرتے ہیں، حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی باوجود اپنی اس کلیمی اور قربِ خاص کے اگر زندہ ہوتے تو اس شریعت کی پیروی کے بغیر کوئی اور طریقہ اختیار نہ فرماتے۔تو ان فقیرانِ بے سروسامان کی کیا ہستی ہے کہ آپ ﷺ کی مخالفت کریں۔اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہی خراب کرتے ہیں اور الحاد وزندقے کے داغ سے مہتم ہوتے ہیں۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہلیت اور تمیز والے لوگ بھی اس جماعت کی پیروی کرنے لگتے ہیں اور شریعت کے پہلو کا مطلق لحاظ نہیں کرتے اور کھلم کھلا نقصان کے باوجود وہ انہیں کامل اور کامل ساز سمجھتے ہیں۔یا پھر ان کی نظروں میں ان کی وہ باتیں جو یہ لوگ کرتے ہیں بالکل شریعت کے مخالف ہی نظر نہیں آتی۔﴿ أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسناً ﴾ یعنی (تو جس شخص کی نگاہوں میں اس کی بدعملی آراستہ کردی گئی ہو اور وہ اسی کو اچھا سمجھنے لگ جائے تو کیا وہ عمل اچھا ہو جائے گا) یا وہ ان کی باتوں کو شریعت کے مخالف تو سمجھتے ہیں، لیکن خیال کرتے ہیں کہ حقیقت شریعت سے الگ ہے اور یہ عین الحاد اور زندقہ ہے۔ہر وہ حقیقت جسے شریعت رَدّ کردے، زندقہ ہی ہوتی ہے۔

چونکہ اس ضعیف فقیر نے جو کچھ حق تعالیٰ کے فضل اور اس طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ کامل حضرت مولانا اسماعیل واڈی صاحب نقشبندیہ مجددیہ رحمہ اللہ تعالیٰ

کے فیض صحبت سے حاصل کیا ان میں سے چند باتیں اس رسالہ میں بیان کی ہیں۔ لکھنے والے کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ذوق اور شوق میں اضافہ ہو، کیونکہ طالبانِ حق کو قوت دیتی ہے اور اہل الحاد کے گروہ میں شامل نہ ہوں۔ اگر وہ اس کے باوجود بھی اُس جماعت کی تقلید ہی کو اختیار کریں گے تو حجت ان لوگوں پر پوری ہو چکی ہوگی۔

اور اول و آخر اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر دائمی رحمتیں اور سلامتیاں ہوں، اور اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔

ألفه

فقیر یوسف احمد نقشبندی مجددی

۲۶ شعبان ۱۴۳۴ھ مطابق ۵/جولائی ۲۰۱۳ء بروز جمعہ

شجرۂ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ

راہِ طریقت میں روحانی نسبت طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں :

(۱) سرورِ دو عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے باطنی نسبت حاصل کی (۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور آپ سے (۳) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت بہار سے بہت کچھ حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ حضور ﷺ نے آپ کو " سَلْمَانُ مِنْ أَهلِ الْبَيْتِ " (سلمان بھی اہل بیت میں سے ہیں) کا شرف بخشا۔ حضرت سلمانؓ سے (۴) حضرت قاسم بن محمدؒ کو باطنی علوم کی نسبت حاصل ہوئی جو پوتے ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے۔ قاسم بن محمد اکابر تابعین میں سے تھے۔ تابعین میں سات فقہا مشہور ہیں جنہیں ظاہری اور باطنی علوم سے وافر حصہ ملا تھا، ان میں ایک حضرت قاسم بن محمدؒ تھے۔ آپ سے (۵) حضرت امام جعفرؒ کو علم باطن میں دو طریقوں سے نسبت حاصل ہوئی تھی۔ ایک تو اپنے والد امام محمد باقرؒ سے اور دوسری حضرت قاسم بن محمدؒ سے (۶) حضرت امام جعفرؒ سے سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کو روحانی تربیت حاصل تھی۔ آپ سے (۷) شیخ ابوالحسن خرقانیؒ آپ کو سلوک میں روحانیت کی تربیت حضرت شیخ بسطامیؒ سے حاصل تھی اور خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ اپنے زمانہ کے پیشوائے مشائخ اور قطبِ زماں ہوئے ہیں۔ آپ سے (۸) شیخ ابوالقاسم گرگانی طوسیؒ جن کا تین واسطوں سے سیّد الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ سے ملتے ہیں۔ اور شیخ ابولقاسمؒ سے (۹) شیخ بوعلی فارمدیؒ آپ خراسان کے اکابر مشائخ میں ہیں۔ حجتہ الاسلام امام محمد غزالیؒ نے بھی آپ سے ہی باطنی تربیت حاصل کی تھی۔ اور شیخ بوعلی فارمدیؒ سے (۱۰) امام ربانی خواجہ یوسف ہمدانیؒ نے حاصل کی اور آپ سے (۱۱) خواجہ بزرگ عبدالخالق غجدوانیؒ نے روحانیت حاصل کی اور ان کے خلفاء میں سے

(۱۲) خواجہ عارف ریوگری ؒ تھے اور ان کے خلفاء میں سے (۱۳) خواجہ محمود انجیر فغنوی ؒ خلیفہ تھے اور آپ کے خلفاء میں سے (۱۴) حضرت خواجہ عزیزاں علی رامیتی ؒ خلیفہ تھے اور آپ کے خلفاء میں سے (۱۵) خواجہ محمد بابا سماسی ؒ خلیفہ تھے اور آپ سے نسبت وارادت حاصل کی (۱۶) حضرت سیّد امیر کلال ؒ نے حاصل کی اور آپ سے (۱۷) شیخ الطریقت حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند ؒ جو اس سلسلہ کے امام ہیں اور ان کو دوسرے طریق سے روحانی نسبت وفیض خواجہ عبد الخالق غجدوانی ؒ سے بھی حاصل ہوئی تھی ۔ اور آپ کے خلفاء میں سے (۱۸) حضرت خواجہ علاء الدین عطار ؒ خلیفہ تھے اور آپ سے نسبت حاصل کی (۱۹) حضرت مولانا یعقوب چرخی ؒ جو نقشبندیہ سلسلہ کے صف اول کے بزرگوں میں سے تھے انہوں نے حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند ؒ کی صحبت سے بھی فیض اخذ کیا تھا ۔ اور آپ کے خلفاء میں سے (۲۰) حضرت خواجہ عبید اللہ احرار ؒ خلیفہ تھے اور آپ سے باطنی نسبت (۲۱) خواجہ محمد زاہد ؒ نے حاصل کی تھی اور ان سے (۲۲) خواجہ محمد درویش ؒ اور آپ سے روحانی نسبت (۲۳) خواجہ محمد واقف ؒ نے حاصل کی اور آپ کے خلفاء میں سے (۲۴) حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ جو ہندوستان میں سب سے پہلے نقشبندیہ سلسلہ لے کر آئے اور آپ سے روحانی نسبت (۲۵) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ؒ آپ کو قطب مدار اور قطب ارشاد کی خلعت سے نوازا گیا اور آپ سے آپ کے صاحب زادہ (۲۶) حضرت خواجہ معصوم ؒ نے روحانی نسبت حاصل کی اور آپ سے آپ کے صاحب زادہ (۲۷) خواجہ سیف الدین ؒ نے نسبت حاصل کی اور آپ سے (۲۸) حافظ قرآن حضرت محسن ؒ نے حاصل کی تھی اور آپ کے خلفاء میں سے (۲۹) حضرت سیّد نور محمد ؒ خلیفہ تھے اور آپ سے یہ باطنی نسبت (۳۰) شہید حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں ؒ نے حاصل کی تھے اور آپ سے (۳۱) حضرت شاہ عبد اللہ ؒ نے حاصل کی اور آپ کے خلیفہ (۳۲) حضرت خواجہ ابوسعید ؒ تھے اور آپ سے باطنی نسبت

(۳۳) حضرت احمد سعید دہلویؒ نے حاصل کی اور آپ سے یہ نسبت (۳۴) خواجہ محمدؒ نے حاصل کی تھی اور آپ سے (۳۵) حضرت خواجہ عثمانؒ نے نسبت حاصل کی اور آپ سے یہ باطنی نسبت (۳۶) خواجہ سراج الدینؒ نے حاصل کی اور آپ سے (۳۷) حضرت خواجہ فضل علی قریشیؒ نے نسبت حاصل کی تھی اور آپ کے زیادہ مرید علماء تھے اور آپ کے خلفاء میں سے (۳۸) حضرت خواجہ مولانا عبد المالک صدیقیؒ تھے اور آپ سے باطنی نسبت (۳۹) حضرت پیر غلام حبیبؒ حاصل کی اور آپ کو حضرت خواجہ فضل علی قریشیؒ سے بھی نسبت حاصل تھی اور آپ سے (۴۰) یہ روحانی نسبت شیخ کامل حضرت مولانا اسماعیل واڈی صاحبؒ نے حاصل کی اور آپ سے اس نسبت کو (۴۱) اس حقیر ضعیف فقیر یوسف احمد اچھاثم نقشبندی مجددی نے حاصل کیا۔

چونکہ پرانے زمانہ میں حقیقی صاحبانِ دل اور کاملانِ حقیقت اور سالکانِ راہِ طریقت بہت تھے۔اور آخر زمانہ میں اُن کی تعداد بہت کم رہی ہے بلکہ " أَعَزَّ مِنَ الْكِبرِيْتِ الاحْمَر" ہوگئے ہیں، طالبانِ صادق کسی مقتدائے اہل یقین کی محبت ومتابعت سے فیض یاب ہوکر اپنی روحانی اصلاح کروا کے اپنے مقتدا کے مکمل تصرفات کو پالیتا تھا، اوران کی مجالس فیض میں مقبولیت حاصل کر کے ان کی صحبت کی سعادت حاصل کرتا تھا۔ اس طرح اُن حضرات کے انتساب کی نسبت سے تصوف اور علمِ باطن میں بے پناہ مقامات حاصل کرتا تھا، چونکہ مشائخ کرام انوارِ حقیقت کے پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ اور وہ انہیں انوار، حقیقت مشکوٰۃ نبوت سے ملتے ہیں۔جس قدر ان پر انوارِ باطن کا اجتماع ہوتا ہے، اسی اندازہ سے وہ اپنے طالبان کو تقسیم کرتے ہیں۔